اچھی، صفحات ۱۴۴۔ قیمت :ے ر، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۔ لکھنؤ،

رویتِ ہلال کا مسئلہ دورِ حاضر کے ان اہم اور پیچیدہ مسائل میں ہے، جو مسلمانوں میں بڑے نزاع و انتشار کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر ہند و پاک کے اصحاب علم وافتا مختلف دموں میں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور ابھی تک اس موضوع پر اس قدر مبسوط اور جامع تحریر نہیں لکھی گئی، اس میں پہلے رویت کے مسئلہ میں شریعت کی اصل روح بیان کی گئی ہے، پھر قدیم فقہی کتابوں میں ریڈیو، ٹیلیفون، تار اور وائرلس کے نظائر تلاش کر کے ان کی روشنی میں ان جدید وسائل کے ذریعہ چاند کی خبروں کے ثبوت و عدم ثبوت پر محققانہ بحث کی گئی ہے، آخر میں مطالع کے متعلق فقہا و مجتہدین کے پرانے اختلافات بیان کر کے اس عہد کے اعتبار سے اس کی حدبندی کی گئی ہے، ہر بحث میں قدیم علماء و فقہا کیساتھ ساتھ جدید مفتیوں اور عالموں کے اقوال بھی تحریر کئے گئے ہیں، گو مصنف کے بعض قیاسات اور رایوں سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ کتاب اُن کی تلاش و تحقیق اور فقہی بالغ نظری کا پورا ثبوت ہے، انھوں نے اس میں بڑے گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں، رویتِ ہلال کا مسئلہ عوام و خواص دونوں اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے، لیکن یہ خالص فقہی و فنی بحث ہے، اور کتاب فقہی حوالوں سے اس قدر گرانبار ہے کہ اس سے علماء ہی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، آخر میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے اجلاس منعقدہ مئی ۶۳ء کی رویتِ ہلال کے بارہ میں منظور کردہ تجویز بھی درج ہے،

"ض"

جلد ۱۰۸۔ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

ہماری بزم علمی کی پرانی یادگاریں روز بروز اٹھتی جاتی ہیں اور ہر مہینہ کسی نہ کسی کا ماتم کرنا پڑتا ہے، گذشتہ مہینہ دو نامور اہل علم نے وفات پائی، ہندوستان میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اور پاکستان میں غلام رسول مہر نے، ڈاکٹر صاحب اس دور کے نامور فاضل اور انگریزی کے مشہور اہل قلم تھے، ان کی پوری زندگی علمی و تعلیمی مشاغل میں گذری، وہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی یا فلسفہ کے پروفیسر تھے، اس سے رٹائر ہونے کے بعد ان کا سارا وقت تالیف و تصنیف میں گذرتا تھا، وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا، اسلامیات پر بھی ان کی نظر وسیع تھی، کلام مجید سے خاص شغف تھا، انکی بیشتر تصانیف اور مضامین کلام مجید اور اسلامی تعلیمات اور تہذیب و ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو پر ہیں، انھوں نے کلام مجید اور مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی ترجمہ کیا، یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، انگریزی تصانیف میں The Mind Al-Quran Builds زیادہ مشہور ہے، اس کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے، ایک کتاب اردو میں "اساس تہذیب" کے نام سے لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے عالمگیر انسانی تہذیب کے عناصر دکھائے گئے ہیں، اردو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا، انھوں نے غالب پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی، اس میں ان کی زندگی کے وہ پہلو بھی دکھائے گئے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار اغماض برتتے ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر

بکثرت مضامین لکھے، ان کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ اپنی وفات سے پہلے انھوں نے قرآنی ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اس کو اپنی تمام تصانیف کا حق اشاعت اور بیس ہزار روپے نقد دیے، ایسے اہل علم مسلمانوں میں اب مشکل سے ملیں گے، اللہ تعالیٰ علم دین کے اس خادم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

غلام رسول مہر صاحب کی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، وہ ایک زمانہ تک اخبار زمیندار کے عملہ ادارت میں رہے، پھر مولانا ظفر علی خاں سے اختلاف کی بنا پر عبد المجید سالک سے مل کر انقلاب کے نام سے اپنا مستقل اخبار نکالا، جو اپنے دور کا مشہور اخبار تھا، اس میں اور زمیندار میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی، انقلاب کے فکاہات جو سالک صاحب کے قلم سے ہوتے تھے، خاص چیز تھے، اس کو لوگ بڑے ذوق سے پڑھتے تھے، مہر صاحب تنہا صحافی ہی نہیں تھے، ان کا علمی و تحقیقی ذوق بھی بلند تھا، انھوں نے حضرت سید احمد شہید بریلوی اور غالب پر بڑی مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ بھی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں، دار المصنفین سے ان کو خاص تعلق تھا، ان سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی، ان کی موت سے ایک نامور اہل قلم اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اس سے پہلے بھی ہم ناظرین کو دار المصنفین کی طرف توجہ دلا چکے ہیں، کہ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت تھی، اور ہندوستان اور پاکستان کی آمدنی کو ملا کر کام چلتا تھا، ادھر کئی سال سے پاکستان کی تجارت کی بندش کی وجہ سے تنہا ہندوستان کی آمدنی پر

دارومدار رہ گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لیے بالکل ناکافی ہے، اور روز افزوں گرانی کی وجہ سے اخراجات برابر بڑھتے جاتے ہیں، اب تک کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا لیکن اگر مستقبل قریب میں آمدنی میں اضافہ کی کوئی شکل نہ نکلی تو اس کے چلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، معارف بھی کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہے، اگر وہ دارالمصنفین کا رسالہ نہ ہوتا تو اب تک بند ہوگیا ہوتا۔

دارالمصنفین نے آج تک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اس نے آمدنی میں اضافہ کی لائف ممبری اور عام ممبری کی شکل نکالی تھی، لائف ممبری کی فیس ایک ہزار تھی اور عام ممبری کی پانسو، لائف ممبروں کو دارالمصنفین کی تمام گذشتہ اور آیندہ شائع ہونے والی مطبوعات اور عام ممبروں کو ممبری کے وقت سے شائع ہونے والی مطبوعات پیش کیجاتی ہیں، اس سے دارالمصنفین کی مدد بھی ہوجاتی تھی اور ممبروں کو انکی رقم کا قریب قریب پورا معاوضہ مل جاتا تھا، ابتدا میں تو کچھ ممبر بنے مگر اسکا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، دارالمصنفین کی خدمات ملک کے سامنے ہیں، اگر اسکی ضرورت ہے تو اس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی قوم پر عائد ہوتی ہے۔

کچھ تنہا دارالمصنفین پر موقوف نہیں مسلمانوں کے سارے اداروں کا یہی حال ہے، یہ نہیں کہ مسلمان بالکل تہی مایہ ہیں، انکے ایک طبقہ کے پاس اب بھی اتنی دولت ہے کہ وہ تفریحی بلکہ مضر مشغلوں میں اتنا روپیہ برباد کرتا ہے کہ اس سے بہت سے ادارے چل سکتے ہیں، مگر اس کی توفیق نہیں ہوتی، جن لوگوں میں لائف ممبری کی استطاعت نہیں ہے، وہ پچاس روپیہ سالانہ کے ممبر بن سکتے ہیں، ایسے ان کو رسالہ معارف اور سال بھر کی نئی مطبوعات دیجائیں گی، اگر وہ پچاس سے کم ہونگی تو اس کے بدلہ میں دوسری کتابیں لے سکتے ہیں

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

(۳)

مغربی تہذیب اور مغربی علوم مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب دوسری قوموں کی اندھی تقلید ہے، ایک زمانہ تک وہ خود دنیا کی قوموں کے معلم اور ان کو علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا درس دیتے رہے، اس زمانہ میں دوسری قومیں ان کی تہذیب کو فخریہ اختیار کرتی تھیں، انھوں نے دوسری تہذیبوں کے اچھے عناصر کو اپنایا بھی، مگر اس کو اسلامی قالب میں ڈھال لیا، ابتدا میں انھوں نے ایرانی تمدن کو اختیار کیا، لیکن ایرانیوں کو اسلام کی دولت دے کر ان کے تمدن پر اسلام کی ایسی چھاپ لگادی کہ وہ اسلامی تمدن کہلانے لگا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے نقصان پہنچا، یہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی جب مسلمانوں پر زوال طاری ہو چکا تھا، ان کی قوت ختم ہو چکی تھی اور ان کی خصوصیات مٹ چکی تھیں، اس کے مقابلہ میں مغربی تہذیب بالکل تازہ دم، جدید علوم اور سائنس کی قوتوں سے مسلح اور ظاہری حیثیت سے بڑی دلکش و دلفریب تھی، اس لیے مسلمانوں نے اس کے مقابلہ میں سپر ڈال دی، اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں میں امتیاز

کیے بغیر آنکھ بند کرکے اس کو قبول کر لیا، بلکہ اس کی خرابیاں زیادہ اختیار کیں، جس سے ان کی ملی حیثیت کو بڑا نقصان پہنچا، اس کی کمزوریوں پر اقبال کی بڑی گہری نگاہ تھی، اور وہ اس کو عالمِ انسانیت کے لیے مہلک سمجھتے تھے، انھوں نے اس کی خرابیوں کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے،

مغربی تہذیب اور مغربی قوموں کی بعض خوبیوں سے انکار نہیں، ان کا جوشِ عمل، علم و فن کی خدمت، سائنسی تحقیقات میں ان کی جانکاہ محنت، قوم و ملک کی راہ میں ایثار و قربانی ان سب سے بڑھ کر سائنسی اکتشافات و ایجادات اور اس قبیل کے دوسرے کارنامے مسلّم اور قابلِ تقلید ہیں، بلکہ انکے بغیر آج کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دنیا کا سارا اخلاقی بگاڑ اسی خدا فراموش تہذیب کا نتیجہ ہے،

اس کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی تصورِ حیات ہے، اس نے انسانی زندگی کی غرض و غایت کو مادیات تک محدود کر دیا ہے، اور قومی شکوہ و عظمت اور دنیاوی عیش و تنعم اس کا نصب العین بن گیا ہے، اس تصور نے مغربی قوموں کو اخلاقی قیود سے آزاد، مادی تعیشات میں غرق، اور انسانی شرف و عظمت سے محروم کر دیا ہے، جس تصورِ حیات کی بنیاد خالص مادیت پر ہوگی، اور وہ خدا کے تصور اور اخلاق و روحانیت سے خالی ہوگا، اس سے کبھی انسانیت کی فلاح نہیں ہو سکتی، اس سے انکار نہیں کہ اس نے انسانوں کے لیے راحت اور تعیش کے اتنے سامان فراہم کر دیے ہیں اور ایسے ایسے حیرت انگیز ایجادات کیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اور مادی حیثیت سے انسانیت کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کے مادی تصوراتِ حیات کی بنا پر اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی، ہر قوم عیش و تنعم میں غرق ہے، سائنس کی ترقی جو انسانیت کے لیے سراسر خیر ہو سکتی تھی، اس کی تباہی کے سامان فراہم کر رہی ہو، بڑی قوموں

میں قوت و اقتدار کی مسابقت برپا ہے، جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ میں ڈال دیا ہے، جس سے خود یورپ کے مفکرین مضطرب اور اخلاق و روحانیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں، لیکن مغربی قوموں کے سائنسی کارنامے اتنے حیرت انگیز ہیں اور ان کی تہذیب اتنی نظر فریب ہے اور اس میں نفس کے مطالبات کی آسودگی کا اتنا سامان ہے کہ اس کی خرابیوں اور ان کے نتائج پر بہت کم نظر جاتی ہے، اور ایک دنیا اس کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے، اقبال اس تہذیب کے بڑے نباض تھے، اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر انکی گہری نظر تھی، اس لیے انھوں نے اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کی خرابیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے، مغربی علوم اور اہلِ مغرب کی عقل و دانش، ایجادات و اختراعات، تدبیر و سیاست اور جمہوری نظام کا بڑا شہرہ ہے، لیکن اخلاق و روحانیت اور نورِ بصیرت سے محرومی کی بنا پر یہ سارے کمالات انسانیت کے لیے خطرہ بن گئے ہیں، اقبال نے علم کی عظمت و شرف، اس کے کمالات اور غرض و غایت کو گوناگوں پیرایوں میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور دکھایا ہے کہ علم جیسے اعلیٰ و اشرف عطیۂ الٰہی کو جس کا مقصد انسانیت کی تکمیل، اس کی دنیاوی و اخروی فوز و فلاح اور اخلاقی فضائل سے آراستگی ہے، مغرب نے اس کو مادیات میں محدود کرکے اس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ انسانی فلاح و سعادت کے بجائے اس کے فساد اور بگاڑ کا ذریعہ بن گئے دنیا کی ساری خرابیوں کی بنیاد مادی نقطۂ نظر ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ ان علوم کو مسلمان بنا لیا جائے۔

گفت حکمت را خدا "خیر کثیر" ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

علم حرف و صوت را شہ پر دہد پاکیِ گوہر بہ ناگوہر دہد

علم را بر اوجِ افلاک است رہ تا ز چشمِ مہر برکند نگاہ

نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل بستۂ تدبیرِ او تقدیرِ کل

دل اگر بندد بحق پیغمبری است ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است نورِ او تاریکیِ بحر و بر است

سینۂ افرنگ را نارے ازو ست لذتِ شب خون و یلغارے ازو ست

تو قتِ ابلیس را یارے بود نور نار از صحبتش نارے بود

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

خوش بداں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

کور را بینندہ از دیدار کن بولہب را حیدرِ کرار کن

یعنی علم اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے، اس نے علم و حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے، جہاں بھی یہ خیر ملے اس کو حاصل کرنا چاہیے، علم حرف اور آواز کو پر پرواز دیتا ہے، اور بد گہر اور نااہل کو بھی اپنے فیض سے گوہر بنا دیتا ہے، علم کی راہ آسمانوں کی بلندیوں پر ہے، وہ مہر و ماہ کی نگاہ کو چھین لیتا ہے، وہ پوری کائنات کی تفسیر ہے، اور اس کی تدبیر سے کائنات کی تقدیر وابستہ ہے، دل اگر حق سے وابستہ ہے تو پیغمبری ہے، اور اگر اس سے بیگانہ ہو تو کافری ہے، اسی طرح علم اگر بغیر سوزِ دروں کے حاصل کیا جائے تو سراسر شر ہے، اور اس کی روشنی بحر و بر کے لیے تاریکی بنجاتی ہے، بقول مولانا روم

علم را بر دل زنی یارے بود علم را بر تن زنی مارے بود

ایسے ہی علم سے افرنگ کا سینہ آگ کی بھٹی بن گیا ہے، اور اس کو قوموں پر یلغار اور ان کے کشت و خون میں لطف آنے لگا ہے، اس کی قوت ابلیس کی یار و مددگار ہے

اور نور بھی اس کی صحبت سے نار بنجاتا ہے، مگر یہ ابلیس دل کی گہرائی میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس لیے اس کو مارنا تو مشکل ہے، اس کی صورت یہی ہے کہ اس کو مسلمان بنا کر قرآن کا تابع بنا لیا جائے، یعنی مغربی علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ لیا جائے، اور ان اندھے علوم میں قوت دیدار پیدا کر کے بولہب کو حیدر کرار بنا دیا جائے،

ایک نظم میں علم کے خیر و شر کے پہلوؤں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

علم اشیا خاک ما را کیمیاست آہ در افرنگ تاثیرش جداست

عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت چشمِ او بے نم دلِ او سنگ و خشت

علم ازو رسواست اندر شہر و دشت جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

گرگے اندر پوستینِ برہ ہر زماں اندر کمینِ برہ

آہ از افرنگ و از آئینِ او آہ از اندیشۂ لا دینِ او

حق را ساحری آموختند ساحری نے کافری آموختند

مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست آدمیت را غمِ پنہاں ازوست

ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر

ایکہ جاں را باز می دانی ز تن سحرِ ایں تہذیبِ لادینی شکن

یعنی علم جو ہماری خاک کے لیے کیمیا کا کام کرتا ہے، افرنگ میں اس کی تاثیر جدا ہے، اس کی عقل و دانش میں اچھے برے کا کوئی معیار نہیں، اس کی آنکھیں گداز قلب کی نمی سے محروم اور اس کا دل سنگ و خشت کی طرح سخت ہے، علم کو اس نے ساری دنیا میں رسوا کر ڈالا ہے، علم کا جبرئیل اس کی صحبت میں ابلیس بن گیا ہے، فرنگیوں کی عقل و دانش تیغ بدوش نوع

انسانی کی ہلاکت کے درپے ہے۔ برہ کی آستین میں بھیڑیا چھپا ہوا ہے، جو ہر وقت دوسرے برہ کی تاک میں لگا رہتا ہے، افرنگ، اس کا آئین اور اس کی لادینی کس قدر افسوسناک ہے، اس نے علم حق کو ساحری اور ساحری کو کافری سکھائی، انسانیت کی ساری مشکلات اور آدمیت کے سارے غم پنہاں کا سبب وہی ہے، اس نے سیکڑوں فتنے بپا کر رکھے ہیں، اے مرد مومن! بڑھکر رہزن کے ہاتھ سے تلوار چھین لے اور اس لادینی تہذیب کا سحر توڑ دے۔

ایک نظم میں علم کی حقیقت اور اس کا مرتبہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است　　پیش چشم ما حجابِ اکبر است

علم را مقصود اگر باشد نظر　　می شود ہم جادہ و ہم راہ بر

می نہد پیش تو از قشر وجود　　تا تو پرسی چیست این راز وجود

جادہ را ہموار سازد این چنیں　　شوق را بیدار سازد این چنیں

درد و داغ تاب و تب بخشد ترا　　گریہائے نیم شب بخشد ترا

علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو　　دیدہ و دل پرورش گیر د ازو

بر مقام جذب و شوق آرد ترا　　باز چوں جبریل بگذارد ترا

عشق کس را کے بخلوت می برد　　او ز چشم خویش غیرت می برد

یعنی جس علم کا مقصد صحیح نہ ہو، وہ انسان کے لیے حجاب اکبر ہے، اور جس کا مقصد صحیح نظر پیدا کرنا ہو، وہ راہ بھی ہے، اور رہنما بھی، وہ انسان کے سامنے وجود کی حقیقت کھول کر رکھ دیتا ہے، انسان کے لیے راہ کو ہموار اور اس کا شوق بیدار کرتا ہے، اسکے دل میں درد و داغ اور تب و تاب پیدا کرتا اور گریۂ نیم شب کی دولت بخشتا ہے، ایسا علم اس جہانِ رنگ و بو کی تفسیر ہے، اور اس سے دیدہ و دل کی تربیت ہوتی ہے۔

وہ جذب و شوق کے مقام پر پہنچا کر جبریل کی طرح خود الگ ہو جاتا ہے (یعنی جس طرح جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام شوق میں پہنچا کر خود الگ ہو گئے تھے،

اگر یک سر موئے بر تر پرم

فروغِ تجلی بسوزد پرم

اسی طرح علم انسان کو مقام شوق میں پہنچا کر الگ ہو جاتا ہے، کیونکہ عشق بڑا غیور ہے، وہ اپنی آنکھ سے بھی غیرت کرتا ہے، کسی دوسرے کو بزم خلوت میں کس طرح پسند کر سکتا ہے، اس موقع پر حضرت بوعلی قلندر کا ایک شعر بے اختیار یاد آ گیا،

غیرت از چشم برم روے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

انھوں نے علم و حکمت کو خدا کا انعام اور مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی ہے، لیکن مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی مضرتوں سے بچنے کی تلقین کی ہے

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است　　این دو قوت اعتبار ملت است

آں فتوحاتِ جہان ذوق و شوق　　این فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق

ہر دو انعام خدائے لایزال　　مومناں را آں جمال است این جلال

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست　　اصل او جز لذت ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است　　این گہر از دست ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد　　علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند　　حاصلش افرنگیاں برداشتند

این پری از شیشۂ اسلافِ ماست　　باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست

لیکن از تہذیبِ لادینی گریز　　زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز

فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد　　لات و عزیٰ در حرم باز آورد

از فسونش دیدۂ دل نابصیر　　روح از بے آبی او تشنہ میر

لذتِ بیتابی از دل می برد　　بلکہ دل زیں پیکرِ گل می برد

یعنی ہمارا برگ و ساز کتاب اللہ اور دنیاوی علم و حکمت دونوں ہیں، انہی کی قوت سے ملت کا اعتبار قائم ہے، کتاب اللہ سے جہان ذوق و شوق کی فتوحات حاصل ہوتی ہیں، اور حکمت سے اس مادی دنیا کی، دونوں خدائے لایزال کا انعام ہیں، ان میں سے ایک مومن کا جمال ہے، دوسرا جلال، علم و حکمت فرنگیوں کی میراث نہیں، وہ تو لذت ایجاد کا نام ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کو پیدا کیا ہے اور وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے گرا ہوا گوہر ہے جس کو دوسروں نے اٹھا لیا ہے، جب عرب یورپ پہنچے تو انھوں نے علم و حکمت کی نئی بنیاد رکھی، دانہ تو ان صحرا نشینوں نے بویا، اور اس کی پیداوار فرنگیوں کے ہاتھ آئی، علم و حکمت ہمارے اسلاف کے شیشے اور ہمارے کوہ قاف کی پری ہے، اس لیے اس کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کرنا چاہیے، لیکن اس لادینی تہذیب سے بچو، وہ اہل حق کے ساتھ برسر پیکار رہتا ہے، یہ فتنہ پرداز بڑے بڑے فتنے بپا کرتی ہے، وہ حرم سے نکالے ہوئے لات و عزیٰ کو پھر حرم میں واپس لاتی ہے، اس کے افسوں سے دل کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے، اور روح اس کی بے آبی سے پیاسی تڑپتی ہے، وہ دل کی بیتابی کی لذت چھین لیتی بلکہ دل ہی کو جسم سے نکال لیتی ہے۔

ایک نظم میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ مغربی علم و حکمت قوموں کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے اس علم و حکمت کا نام انھوں نے حکمت فرعونی رکھا ہے، اس کی خصوصیات اور کارنامے یہ بتائے ہیں:

حکمتے از بندِ دیں آزادۂ　　از مقامِ شوق دور افتادۂ

مکتب از تدبیر او گیرد نظام　　تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام

شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں　　بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں[1]

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر　　کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر

می شود در علم و فن صاحب نظر　　از وجودِ خود نہ گردد باخبر

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن　　نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

دخترانِ او بزلفِ خود اسیر　　شوخ چشم و خود نما و خوردہ گیر

ساعدِ سیمیں شاں عیشِ نظر　　سینۂ ماہی بموج اندر نگر

ملتے خاکسترِ او بے شرر　　صبح او از شامِ او تاریک تر

ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ　　کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

قوتِ فرمانروا معبودِ او　　در زیانِ دین و ایماں سودِ او

دینِ او عہد و وفا بستن بغیر　　یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ غیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ

مُرد و مرگِ خویش نشناختہ　　(مسافر)

یہ حکمت دین کی قید سے آزاد اور مقام ذوق و شوق سے دور ہے، وہ تعلیم کا

---

[1] اس خیال کو انھوں نے اردو کے ایک قطعہ میں بھی ظاہر کیا ہے:

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں　　آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب　　کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

غلام اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے، تاکہ غلام آقا کے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھے، شیخ ملت بھی، نقشین انداز میں اس کے مفاد کے مطابق دین کی تجدید کرتا ہے، اس قوم کی حالت قابل افسوس ہے، جو دوسروں کی تدبیر کی کشتہ ہے، اور اس کا کام اپنی تخریب اور دوسروں کی تعمیر ہے، اس علم سے اگرچہ علم و فن میں صاحب نظر ہو جاتی ہے لیکن اپنے وجود اور اپنی انفرادیت سے بے خبر رہتی ہے، اس کے بوڑھے حیا و شرم سے بیگانہ اور عورتوں کی طرح اپنے جسم کی آرائش میں مشغول رہتے ہیں، ان کی لڑکیاں اپنی کنگھی چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں، شوخ چشم، خود نما اور خوردہ گیر ہوتی ہیں، ان کے ساعد سیمیں دوسروں کے ذوق نظر کا سامان فراہم کرتے ہیں، اور موجوں کے اندر سینۂ ماہی کا منظر پیش کرتے ہیں، ایسی ملت کی خاکستر میں زندگی کا کوئی شرر نہیں ہوتا، اس کی صبح اس کی شام سے زیادہ تاریک ہوتی ہے، وہ ہر وقت دنیاوی ساز و سامان کی تلاش میں رہتی ہے اس کا کام صرف فکر معاش اور موت کا خوف ہے، فرمانرواکی قوت اس کی معبود ہوتی ہے، اور دین و ایمان کے نقصان میں اس کو فائدہ نظر آتا ہے، اس کا مذہب دوسروں کی وفاداری یعنی حرم کی اینٹ سے دیر کی تعمیر ہے، اس قوم کی حالت کس قدر عبرتناک ہے، جس نے حق سے دل موڑ لیا ہے، وہ مرچکی ہے لیکن اپنی موت کو نہیں پہچانتی،

یہ محکوم اور غلام قوموں کی کیسی مکمل تصویر ہے، گو یہ تصویر انگریزوں کے دور کی ہے لیکن آج کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں ہیں،

مغربی قوموں کی ترقی کا حقیقی سبب مغربی تہذیب کا سب سے بڑا سحر اس کی مادی ترقی اور سائنس کی ایجادات و اکتشافات ہیں، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں، لیکن مغربی قوموں کی ترقی کا سبب ان کے عیوب نہیں، بلکہ ان کی خوبیاں، انکے کمالات اور علم و فن میں ان کی جانکاہ محنت ہے، مشرقی

قوموں میں سہل پسندی کی بنا پر ان کمالات کو حاصل کرنے کی تو ہمت نہیں ہوتی، محض مغربی تہذیب کی خرابیوں اور اس کی ظاہری چمک دمک کی تقلید میں مبتلا ہیں،

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب — باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است — نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست — مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ — مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست — ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکرِ چالاکے اگر داری بس است — طبعِ درّاکے اگر داری بس است
گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ — گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
ملکِ معنی کس حدِّ او را نبست — بے جہادِ پیہمے ناید بدست
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود — می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو — علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را — فطرتِ او در پذیرد سہل را
سہل جستن در دریں دیرِ کہن — ایں دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن

یعنی مشرق کو مغرب کی تقلید نے از خود رفتہ کر دیا ہے، اس کا کام تو اس کی تنقید تھا، نہ کہ اندھی تقلید، مغرب کی قوت چنگ و رباب اور بے حجاب لڑکیوں کے رقص و سرود

لالہ رو دوشیزاؤں کی ساحری، ان کی عریانی اور فیشن پرستی اور ان کا استحکام لادینی اور ان کی ترقی لاطینی حروف کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان کی قوت کار راز ان کا علم دفن ہے، اسی کی آگ سے ان کا چراغ روشن ہے، علم کسی خاص لباس کا پابند نہیں اور عمامہ حصول علم میں مانع نہیں ہے، اصل مقصود علوم اور ان کی طلب ہے، لباس کوئی بھی ہو اس کے لیے فکر چالاک اور طبع رسا کی ضرورت ہے، علم جانکاہ محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، بلکہ معنی میں علوم کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، اور وہ مسلسل جد و جہد کے بغیر ہاتھ نہیں آتے مگر فرنگیوں کے غلاموں نے نمود و نمایش کے لیے ان کے صرف رقص و سرود کی نقل و تقلید کی، علم بڑی کٹھن چیز ہے، وہ جانکاہی چاہتا ہے، اور خون پسینہ ایک کیے بغیر حاصل نہیں ہوتا، ہماری تن آسانی اور سہل پسند فطرت نے مشکل کے مقابلہ میں صرف آسان چیز کر لیا، حالانکہ دنیا میں آسانی کی تلاش کے معنی یہ ہیں کہ جسم میں جان باقی نہیں رہی۔

مغربی تعلیم

علم و فن کے بارے میں مغربی قوموں کے نقطۂ نظر اور اس کی غرض و غایت میں جو خرابیاں ہیں، وہی ان کے نظام تعلیم میں بھی ہیں، کیونکہ دونوں لازم ملزوم ہیں، بلکہ اصل بنیاد جس سے انسان کے ذہن و دماغ کی تربیت ہوتی ہے، اور اس کے خیالات بنتے اور بگڑتے ہیں، تعلیم ہی ہے، اس لیے انھوں نے مغربی علوم پر جو تنقید کی ہے، وہی نظام تعلیم پر بھی ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے،

ان کے نزدیک اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی اس کا مادی نقطۂ نظر ہے، جو مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ملی مزاج اور اُن کی ضروریات سے مطابقت نہیں کرتا، اور اس سے ان کی خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں، یہ تعلیم نہ صرف دینی روح سے خالی ہے، بلکہ مذہب و اخلاق کے بھی سراسر خلاف ہے،

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم / ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

وہ دینی روح کو ختم کر دیتی ہے

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا / کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اس کا نتیجہ الحاد و بے دینی ہے،

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ / ناداں ہیں جنکو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی / اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام / ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور / مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است / ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

یہ تعلیم عقل کو تو آزاد کر دیتی ہے، لیکن خیالات کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر / چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اگر انسان میں صحیح فکر و تدبر کا سلیقہ نہیں ہے تو آزادی افکار اس کی تباہی کا سامان... اور اس کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے،

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی / رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار / انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

قوموں سے زندگی کی روح ختم کر دیتی ہے،

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی / کہ از وے روح یک قومے تواں کشت

اس کی خصوصیات چھین کر اس کو بے جان کر دیتی ہے،

نوا از سینۂ مرغ چمن برد / ز خون لالہ آں سوز کہن برد

بہ این مکتب بہ این دانش چہ نازی
کہ نان در کف نداد و جان ز تن برد

زندگی کی ضروریات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں کرتی، اس لیے اس سے زندگی کا چراغ روشن نہیں ہوتا،

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں میں کشادِ کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اعلیٰ اخلاقی فضائل اور انسانی کمالات سے محروم کر دیتی ہے،

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا ہے خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اس تعلیم کا طالب علم اگرچہ دیکھنے میں زندہ نظر آتا ہے، لیکن حقیقۃً وہ مردہ ہے، اس کی سانس تک فرنگ سے مستعار ہے، اس کی صحیح ترتیب مردِ مومن کی نگاہ ہی کر سکتی ہے،

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پرورش دل کی اگر مدِ نظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

اس کا مقصد قوموں کی خصوصیات کو مٹا کر ان کے دل و دماغ کو مفتوح کرنا اور اس کو فرنگی تہذیب کے قالب میں ڈھالنا ہے، اس راز کو ایک فرنگی مفکر کی زبان سے افشا کرتے ہیں،

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یعنی جو کام فوجی قوت انجام نہیں دے سکتی وہ تعلیم انجام دیتی ہے، توپ اور تلوار جسم کو تو فتح کر لیتے ہیں، لیکن ذہن و دماغ کو فتح نہیں کر سکتے، اس کام کو تعلیم انجام دیتی ہے۔

اس موقع پر اکبر الہ آبادی کا ایک ظریفانہ مگر حکیمانہ شعر یاد آگیا،

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

نوجوانوں کو تعیشات میں پھنسا کر ناکارہ بنا دیتی ہے، اقبال کس درد سے کہتے ہیں

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

ان خرابیوں کے باوجود وہ مغربی علوم کی طرح تعلیمِ جدید کے بھی مخالف نہیں، بلکہ اسکے مادی نقطۂ نظر کے خلاف ہیں، اور اس کی اصلاح کا ذریعہ ان کے نزدیک مذہب ہے، اگر دل میں دین کی حرارت موجود ہے، تو جدید تعلیم کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، لیکن اگر اس سے خالی ہے تو ایک مسلمان کے لیے پیامِ موت ہے،

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

کھلے ہیں سب کے لیے مغربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

وہ جس قسم کی تعلیم چاہتے ہیں اس کا خلاصہ انھوں نے ایک قطعہ میں بیان کر دیا ہے،

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش

بدستِ او اگر دادی ہنر را
ید بیضاست اندر آستینش

یعنی مسلمان نوجوانوں کی صحیح تعلیم و ترقی کے لیے دین اور علم و ہنر تینوں کی تعلیم ضروری ہے،

اسی سے وہ ماہ و انجم بن کر چمک سکتے ہیں،

فرنگی سیاست[1] اوپر مغربی علوم کے سلسلہ میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان سے بھی مغربی سیاست کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، اس پر اقبال نے مستقل نظمیں بھی لکھی ہیں، ان کے نزدیک مغربی سیاست سراسر ابلیسی ہے،

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ   مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے   بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اس کا مقصد محض کمزور قوموں کو غلام بنانا اور ان سے تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے، یورپ کی جمہوریت سے جس کا غلغلہ اتنا بلند ہے، مردہ قومیں اور زیادہ مردہ ہو جاتی ہیں، یورپ کے ڈپلومیٹوں اور مدبروں نے دنیا کی قوموں کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ بنا رکھا ہے، اور ہر وقت ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں، کسی کے حصہ میں مال و زر آتا ہے، کسی کے حصہ میں رنج و نامرادی، حقیقت یہ ہے کہ ہم سب مال تجارت ہیں، اور وہ اس کے سوداگر، اگرچہ افرنگیوں کے شیوے رنگا رنگ ہیں، لیکن ان سے عبرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا،

دانشے برد مقیدِ جمہورِ فرنگ   مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
حقہ بازاں چوں سپہر گرد گرد   از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد
شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر   ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

---

[1] یہ واضح رہے کہ یورپی سیاست کی نظمیں آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی ہیں، جبکہ بیشتر ایشیائی ملک یورپ کے غلام تھے، اب قریب قریب سب آزاد ہو چکے ہیں، اس لیے ان نظموں کو اس وقت کے حالات کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، گو اب سیاست کی شکل بدل گئی ہو لیکن اس کی روح اب بھی وہی ہے۔

فاش باید گفت سرِ دلبراں   ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ   من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

ایک نظم میں اس کی تاجرانہ سیاست کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

وانی از افرنگ و از کارِ فرنگ   تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو   ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی پادشاہی قاہری ست   قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج   از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر ست   بر زبانش خیر و اندر دل شر است
وقتِ سودا خند خند و کم خروش   ما چو طفلانیم او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہ مشتری ست   یارب ایں سحر است یا سوداگری ست
تاجرانِ رنگ و بو بردند سود   ما خریداراں ہمہ کور و کبود
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر   چرب دستیہائے یورپ را نگر

یعنی کیا فرنگ کے کاروبار سے تم واقف نہیں، آخر اس کے سحر میں کب تک گرفتار رہو گے، ہمارے سارے مصائب و مشکلات کا سبب اس کی تاجرانہ سیاست ہے، اور ہم اس سے چارہ گری کی امید رکھتے ہیں، اس زمانہ میں حکومت بھی تجارت بن گئی ہے، اور دکان داری بھی تاج و تخت میں شریک ہے، اس لیے وہ محکوم سے خراج حاصل کرتا ہے اور تجارتی نفع بھی، جو حکمراں تاجر ہو، اس کی زبان پر تو خیر ہوتا ہے، لیکن اسکا باطن شر سے معمور رہتا ہے، وہ تجارت کے وقت ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، اسکی حیثیت شکر فروش کی اور ہماری بچوں کی ہے، وہ خریدار کے مذاق اور طبیعت کے

رجحان سے خوب واقف ہوتا ہے، اس لیے اس کی سوداگری ساحری بن گئی ہے، ہم اندھے بہرے خریدار ہیں، اس لیے رنگ و بو کے یہ تاجر ہم کو خوب لوٹتے ہیں، عصر حاضر کے کاروبار سے بے خبر۔ یورپ کی چرب زبانی اور چابک دستی سے ہوشیار رہنا چاہیے، اس سیاست اور تجارت کے لیے انھوں نے بڑے خوش رنگ پھندے بنائے ہیں ان میں جمہوریت بھی ہے، مگر ان کی جمہوریت درحقیقت استبداد کے چہرے کی نقاب ہے، جس کی آڑ میں دیو استبداد چھپا ہوا ہے، اور اس کی سیاست کے سارے روپ رنگ و بو کا سراب ہیں، جس کو نادان گلستان سمجھ رہے ہیں،

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردہ میں نہیں جز از نوائے قیصری
دیو استبداد ہے جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق   طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو   آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم میں ایک دوسرے دام جمعیۃ الاقوام کا پردہ فاش کرتے ہیں،

می کند بند غلاماں سخت تر   حریت می خواند آں را بے بصر
گرمی ہنگامۂ جمہور دید   پردہ بر روے ملوکیت کشید
سلطنت را جامع اقوام گفت   کار خود را پختہ کرد و خام گفت
در فضایش بال و پر نتواں کشود   با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس، اے دردمند   آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ   او نباشد ایمن از شاہین و چرغ
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست   نالہا اندر گلوے او شکست

الحذر از گرمی گفتار او   الحذر از حرفِ پہلودار او
چشمہا از سرمہ اش بے نور تر   بندۂ مجبور از و مجبور تر
از خودی غافل نگردد مردِ حر   حفظ خود کن حبِ افیونش مخور

یعنی مغربی سیاست کے فریب سے جس چیز کو نادان آزادی سمجھتے ہیں، وہ غلامی کو اور زیادہ سخت کر دیتی ہے، اس کی جمہوریت کا شور ملوکیت کے چہرہ کی نقاب ہے، انھوں نے اپنی حکومت اور سیاست کو جمعیۃ الاقوام کا لباس پہنا کر اپنا کام اور پختہ کر لیا ہے، اس کی فضاؤں میں پر پرواز کھولنا ممکن نہیں ہے، اس کی کنجی سے کوئی دروازہ بھی نہیں کھل سکتا، اس کی گرمی گفتار اور پہلودار باتوں سے بچنے کی ضرورت ہے، اس کے سرمہ سے آنکھیں اور بے نور ہو جاتی ہیں، اور مجبور غلام اور بھی مجبور ہو جاتا ہے، لیکن مردِ حر اپنی خودی سے غافل نہیں ہوتا، اس لیے اپنی حفاظت کا سامان کرنا اور اس کی افیون کے نشہ سے بچتے رہنا چاہیے،

پرانی مجلس اقوام کی حقیقت[1] اقبال نے جس طرح چار مصرعوں میں ظاہر کر دی ہے، وہ سیکڑوں اشعار پر بھاری ہے،

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن   دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند   بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ کی سیاست دین کی روح سے خالی اور ایک دیو بے زنجیر ہے،

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں   کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد   فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

---

[1] موجودہ جمعیۃ الاقوام بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

جو قوت دین سے خالی ہوگی وہ زہر ہلاہل اور دنیا کے لیے ہلاکت و تباہی کا پیام ہے، یہی قوت جب دین کے حصار میں آجاتی ہے تو تریاق بنجاتی ہے،

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھکر
ہو دیں کی حفاظت تو ہر زہر کا تریاک

جو قوم خدائی نور سے محروم اور اکل حلال کے نکتہ سے ناواقف ہوگی وہ دوسروں کا جینا وبال کر دیگی، فرنگی اس سے محروم ہیں، اس لیے ان میں حلال و حرام کی تمیز نہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو چرتی ہے، ایک دانہ بوتی ہے، دوسری اس کی پیداوار پر قبضہ کرتی ہے، اس کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھیننا اور انکے جسم سے جان نکال لینا ہی حکمت ہے، اس تہذیب کا شیوہ آدم دری ہے، اور اسکا پردہ تجارت ہے،

نا نداند نکتۂ اکل حلال — بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشم او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام
اُمتے بر امتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری است — پردۂ آدم دری سوداگری است

ان ساری خرابیوں کی بنیاد دین و سیاست کی علحدگی ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ دونوں کو ملا دیا جائے، اسی میں انسانیت کی فلاح ہے، جس کا نمونہ اسلام پیش کر چکا ہے،

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(باقی)

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے، اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہوسکی، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، سوانح حیات کے بعد پہلے انکی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور انکے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ (طبع دوم)

(مرتبہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم) قیمت :- [illegible]

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ ڈی (لنڈن) سابق پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

(۲)

۶۔ درہم۔ درہم چاندی کا ایک چھوٹا سکہ تھا، جو ظہور اسلام کے وقت ایرانی سلطنت میں رائج تھا، اور عراق (مثلاً حیرہ وغیرہ) میں بھی مروج تھا، جو اس زمانے میں کسریٰ کے زیر نگیں تھا۔ درہم کا لفظ قدیم عربی شاعروں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اور گمان غالب ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب اس سکہ سے ایرانیوں ہی کے واسطہ سے واقف ہوئے تھے، کیونکہ ان کے اپنے ملک میں نہ کوئی دار الضرب تھا اور نہ کوئی اپنے مخصوص سکے تھے، ہمسایہ ملکوں میں جو درہم و دینار چلتے تھے انہی سے کام چلاتے تھے۔

درہم کا لفظ بصیغۂ جمع (یعنی بصورت دراہم) قرآن مجید میں صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے، سورۂ یوسف میں ہے:

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ	اور انھوں نے اس کو (یعنی یوسفؑ کو)
مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ	چند درہموں کے بدلے میں سستے داموں
الزَّاهِدِينَ	بیچ ڈالا اور انھوں نے اسکی کچھ قدر نہ پہچانی۔

علمائے لغت میں سے کسی نے درہم کو یونانی اور کسی نے پہلوی بتایا ہے، یہ دونوں قول اپنی اپنی جگہ درست ہیں، کیونکہ درہم اگرچہ دراصل یونانی کلمہ Drachme ہے

لیکن عربوں کے ہاں پہلوی کے واسطہ سے ایران سے آیا ہے۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونان اور ایران کے درمیان اختلاط بڑھ گیا تھا، اور اس کے ایک سپہ سالار سلوکس نے ایران میں ایک مستقل خاندان کی بنیاد ڈالدی تھی۔ ان حالات میں گمان غالب یہی ہے کہ درہم پہلے ایران میں یونانی حکومت کے اثر سے رائج ہوا۔ پھر وہاں سے عراق اور دیار عرب میں پہنچا۔ قدیم سکوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ درہم کو اختیار کرتے وقت ایرانیوں نے اس کے نقوش میں اپنے معاشرے کی مناسبت سے قدرے تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ ساسانی عہد میں جو درہم مضروب ہوئے، اُن میں ایک طرف شاہ وقت کی شبیہ ہے، اور دوسری طرف ایک آتشکدہ کا نقش ہے، جس کے دونوں طرف دو پروہت کھڑے ہیں۔

درہم کا رواج ایران کی فتح کے بعد اسلامی عہد میں کئی صدیوں تک جاری رہا اور خلیفہ عبد الملک اموی نے درہم و دینار پر عربی کلمات نقش کرائے۔ اگرچہ مشرقی ملکوں میں درہم ایک مدت سے متروک ہو چکا ہے، لیکن اپنے اصلی ملک یعنی یونان میں قومی سکہ کی حیثیت سے آج تک بدستور مروج ہے، یہی اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ درہم کی اصل یونانی ہے۔

تنبیہ:- شیخ غلام احمد پرویز اپنی "لغات القرآن" (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء) میں درہم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ رومی لفظ Drawburg کا معرب ہے"۔ معلوم نہیں کہ پرویز صاحب نے یہ بے سروپا بات کہاں سے اخذ کی ہے۔

یہ یونانی کلمہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بعض مغربی زبانوں میں بھی دخیل ہو چکا ہے، چنانچہ انگریزی میں Dram کی صورت میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ذیل کے

نقشہ سے ظاہر ہے۔

Greek : Drakhme (دراخمہ)

Latin : drachma — Pahlavi : درہم

Med Latin : drarna — Arabic : درہم

Old French : dramc.

English : dram

۷۔ دینار۔ دینار ایک طلائی سکہ تھا، جو ظہورِ اسلام کے وقت رومی سلطنت میں رائج تھا، ظہورِ اسلام سے پہلے عرب رومی مقبوضات یعنی شام اور فلسطین کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے، اس لیے دینار سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ دینار کا ذکر قرآن مجید (سورۂ آلِ عمران) میں یوں آیا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا	اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم اُن کے پاس ایک قنطار امانت رکھ دو تو وہ اسے واپس ادا کر دینگے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی بطور امانت رکھو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو تمھیں کبھی واپس نہ دیں گے۔

جیسا کہ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ دینار کے بارے میں اختلاف ہے۔

علمائے لغت اس سے آگاہ تھے کہ دینار عجمی لفظ ہے، اور بعض نے اس کے ساتھ یہ ادعا بھی کیا ہے کہ فارسی زبان سے لیا گیا ہے، ابو منصور جوالیقی نے کتاب المعرب میں لکھا ہے کہ "قیراط اور دیباج کی طرح دینار کی اصل عجمی ہے، لیکن عرب قدیم زمانے سے ان الفاظ کو بولتے آئے ہیں، اس لیے وہ عربی بن گئے ہیں"۔ راغب اصفہانی 'مفردات القرآن' میں لکھتے ہیں کہ دینار اصل میں دِنّار تھا، اور اس بارے میں انھوں نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے کہ دینار فارسی "دین آر" کا معرب ہے، یعنی وہ چیز جسے شریعت لائی ہو، لیکن اس قول کا مہمل اور لایعنی ہونا عیاں ہے۔

اس مسئلہ کو سلجھانے کی شکل یہ ہے کہ اس معاملہ پر تاریخی لحاظ سے نگاہ ڈالی جائے، اور یہ دریافت کیا جائے کہ یہ سکہ سب سے پہلے کس ملک میں یا کس قوم کے ہاں جاری ہوا تھا، مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ دینار، لاطینی لفظ "Denarius" سے ماخوذ ہے، اور یہ لفظ رومیوں کے ہاں ایک طلائی سکے کے لیے مستعمل تھا، مورخین نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے دو سو برس پہلے دینار دارالسلطنت روم میں مضروب ہوا، اور بعد میں اس کا استعمال رومیوں کے ہاں بدستور جاری رہا، جب رومی سلطنت مشرق کی طرف پھیلی تو ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ دینار کا رواج بھی مشرقی ملکوں میں پھیلتا گیا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں شام اور فلسطین میں (جو اُس وقت رومیوں کے زیرِ نگیں تھے) دینار کا عام رواج تھا، جو بعد کے زمانے میں بھی بدستور قائم رہا، ظہورِ اسلام سے پیشتر شام کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے، لہٰذا تجارت کے ذریعہ اُن کا دینار سے آشنا ہونا طبعی اور یقینی امر ہے، اور قرآن پاک میں دینار کا لفظ جس بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہورِ اسلام

کے وقت دینار عربوں کے ہاں ایک معروف چیز تھی۔

جب عرب فاتحین نے رومیوں کو شام اور مصر سے نکال دیا، اُس وقت بھی ان ملکوں میں دینار کا رواج بدستور جاری رہا، مگر ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ خلفائے اسلام نے آخر میں اپنے ہاں دار الضرب قائم کیے، اور خلیفہ عبد الملک اموی نے مروجہ سکوں پر عربی کلمات نقش کرائے۔ دینار کا استعمال رفتہ رفتہ تمام اسلامی سلطنت میں پھیل گیا، اور درہم و دینار کئی صدیوں تک اسلامی ملکوں میں ساتھ ساتھ رائج رہے۔

۸۔ زنجبیل۔ زنجبیل ادرک کا عربی نام ہے، اور ادرک جب خشک ہو جائے تو ہندی میں اُسے سونٹھ کہتے ہیں، ادرک ایک پودے کی خوشبودار گٹھیلی جڑ ہے، جو مسالے کے طور پر کام آتی ہے، دواؤں میں بھی ڈالی جاتی ہے، اور اس کا مربا بھی بناتے ہیں، اگر ادرک کی گانٹھ کو غور سے دیکھا جائے تو اس پر سینگ کی طرح چھوٹے چھوٹے ابھار دکھائی دیتے ہیں، غالباً اسی وجہ سے ادرک کو سنسکرت میں شرنگ ویرا (Shrngvera) کہتے ہیں یعنی ایسا جسم جو سینگوں پر مشتمل ہے۔

زنجبیل کا لفظ قرآن مجید (کی سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے:

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ — یعنی وہاں ان کو ایسا جام پلایا جائیگا

مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا — جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔

اکثر لغت نویس اس بات پر متفق ہیں کہ زنجبیل کا لفظ فارسی زبان سے آیا ہے، چنانچہ ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں اور جوالیقی نے کتاب المعرب میں اس کو اُن فارسی الفاظ میں شمار کیا ہے، جن کو معرب کر لیا گیا ہے، اور امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی اس

قول کو قبول کر لیا ہے، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کے ماخذ کے لیے پہلوی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جو موجودہ فارسی کی قدیم صورت تھی، پہلوی میں ادرک کو سنگبیر کہا گیا ہے، جس کا زنجبیل کی شکل میں تبدیل ہو جانا بعید از فہم نہیں۔

زنجبیل کا استعمال نہایت قدیم ہے، یونانی اور رومی اسے بحر احمر (یعنی بحر قلزم) کے راستے سے حاصل کرتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ زنجبیل جنوبی عرب کی پیداوار ہے، حالانکہ اس کا حقیقی وطن ہندوستان تھا، اور عرب اُسے فلفل (یعنی سیاہ مرچ) کی طرح ہندوستان کے مغربی ساحل یعنی مالابار سے برآمد کرتے تھے، چونکہ زنجبیل ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، اس لیے عہد حاضر کے محققین کی یہ رائے ہے کہ اس لفظ کی اصل ہندوستان کی سرزمین میں تلاش کرنی چاہیے۔ ان کی رائے میں زنجبیل کے یونانی اور لاطینی نام یعنی Zingiber اور Ziggiber دونوں ہندوستان کی کلاسیکی زبان یعنی سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ زنجبیل کو سنسکرت میں شرنگ ویرا اور پالی زبان میں (جو بلحاظ زمانہ اس سے متاخر ہے) سنگ ویرا کہتے ہیں، اس کا پہلوی نام یعنی سنگبیر اس کے پالی نام سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ پہلوی نام پالی سے ماخوذ ہو۔

غیاث اللغات کے مؤلف نے رسالہ "معربات" اور "سروری" (عربی شرح گلستان) کے حوالے سے لکھا ہے کہ زنجبیل زنگویرا کا معرب ہے، لیکن اس نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ زنگویرا پالی زبان کا لفظ ہے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، عربوں کے تجارتی تعلقات براہ راست جنوبی ہند کے ساتھ قائم تھے، اس لیے اس کا بھی قوی

احتمال ہے کہ انھوں نے زنجبیل کا نام جنوبی ہند کی اہم زبان یعنی تامل سے لیا ہو۔ تامل میں اسے Inchevar کہتے ہیں۔

زنجبیل کو لاطینی میں Zingiber اور فرانسیسی میں Gingembre کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ Ginger انہی سے ماخوذ ہے۔[1]

زنجبیل کے لیے مختلف زبانوں میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ان کے اشتقاق اور باہمی تعلقات کی وضاحت کے لیے ذیل کا شجرہ ملاحظہ ہو:-

Sanskrit : Shrangvera
|
Pali : Singivera
|
Pahlavi : Singaber
|
Latin : Zingiber — Arabic : Zanjabil
|
Old French : Gengiber
|
English : Ginger
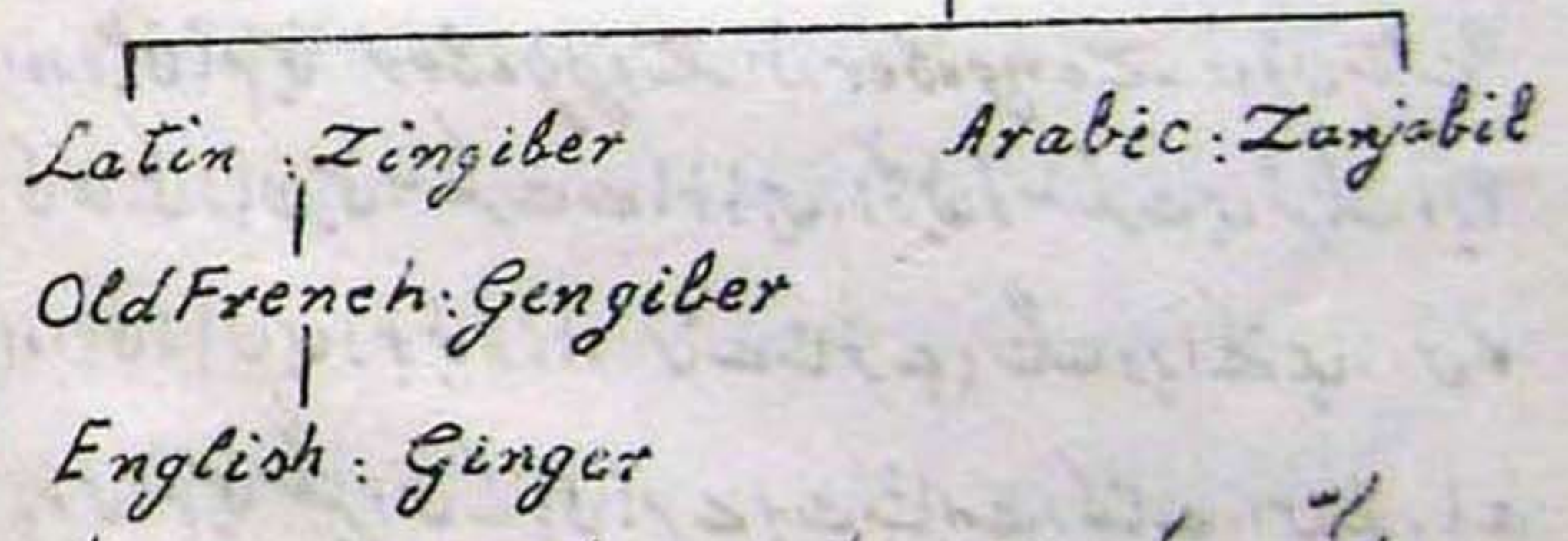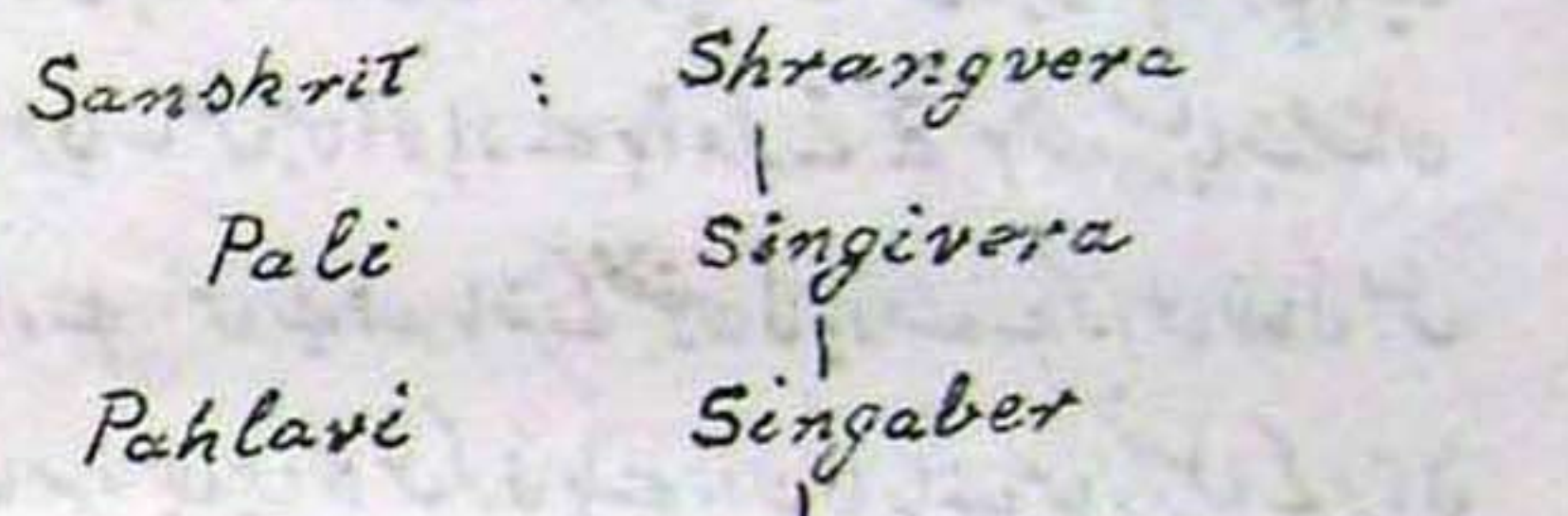
۹۔ سکین: سکین کا لفظ قرآن پاک میں چھری کے معنے میں آیا ہے اور صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے کہ

وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا — اس نے (یعنی یوسفؑ کی مالکہ نے) ان (مہمان) عورتوں میں سے ہر ایک کو ایک چھری دی

[1] پروفیسر ڈاکٹر Allan Ross آجکل برمنگھم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے صدر ہیں۔ انھوں نے Ginger کی لسانی تحقیق میں ایسا کمال پیدا کیا ہو اور میں اس استیعاب اور استقصاء سے کام لیا ہے کہ انکے احباب نے انکو ازراہ ظرافت Ginger Ross کا nick-name دے رکھا ہے۔

امام راغب اصفہانی "مفردات" میں لکھتے ہیں کہ

السِّكِّينُ سُمِّيَ لِإِزَالَتِهِ حَرَكَةَ الْمَذْبُوحِ — یعنی چھری کو سکین اسلیے کہا گیا ہے کہ وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے"۔

میری رائے میں امام ممدوح نے سکین کی جو توجیہ فرمائی ہے، وہ ان کا ذاتی قیاس ہے جس کی تائید کسی دوسری روایت یا شہادت سے نہیں ہوتی۔

ابو منصور جوالیقی، امام سیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی سکین کو معربات میں شمار نہیں کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی یہ لفظ خالص عربی ہے۔

لیکن مغربی علماء کا خیال ہے کہ سکین کا لفظ آرامی ہے، جو عربی میں باہر سے آکر دخیل ہوا ہے۔ اس کی تائید دیگر قرائن کے علاوہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جن ایام میں ہادیٔ انام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک دن آپ نے انصار سے فرمایا کہ اِئْتِنِي السِّكِّينَةَ یعنی "مجھے سکین دو"۔ لیکن حاضرین میں سے کسی نے رسول مقبولؐ کی بات نہ سمجھی۔ آخر کار جب آپ نے اپنا مطلب سمجھایا تو انصار بولے کہ اچھا، آپ کو "مُدْيَة" درکار ہے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سکین کا لفظ مدینہ میں معروف نہ تھا۔ بلکہ وہاں کے لوگ چھری کے لیے مُدْيَة کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ عہد نبوی میں فلسطین اور شام میں آرامی عوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی، اس لیے یہ بات عین ممکن ہے کہ قریش کے تجارتی روابط سے سکین کا لفظ مکہ میں بھی رائج ہو گیا ہو۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے، اسی طرح راوی حدیث کے قول کے مطابق یہ لفظ صرف اسی ایک حدیث میں پایا گیا ہے۔

۱۰۔ صراط ۔ صراط کا لفظ قرآن مجید میں تقریباً ۴۵ مرتبہ آیا ہے، صراط کے لغوی معنے راستہ کے ہیں، لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ ایک خاص مذہبی رنگ میں استعمال ہوا ہے، یعنی صراطِ مستقیم صحیح مذہبی روش کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ہے:

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

اگرچہ جوالیقی اور خفاجی نے صراط کو معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا ہے، لیکن امام سیوطی نے اتقان میں النقاش اور ابن الجوزی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صراط رومی زبان میں راستہ کو کہتے ہیں، اور ان سے پہلے ابو حاتم احمد بن حمدان الرازی (متوفی ۳۲۲ھ) بھی اپنی کتاب الزینہ میں اس کو رومی الفاظ میں شمار کر چکا تھا[1]۔ عہد حاضر کے مغربی محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ صراط دراصل لاطینی (یعنی رومی) لفظ Strata ہے، جو پہلے شام میں مروج ہوا، اور پھر سریانی کے واسطے عربی میں داخل ہوا۔

صراط کا لفظ جاہلی شعراء کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ خاصے قدیم زمانے ہی سے عربی میں منتقل ہو چکا تھا، اور قرآن مجید میں جس کثرت اور بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت صراط عربی کا ایک عام فہم لفظ بن چکا تھا۔

[1] کتاب الزینہ، تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر حسین بن فیض اللہ ہمدانی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۷ء جزو اول، ص ۱۳۶

۱۱۔ فرعون ۔ فرعون مصر قدیم کے حکمرانوں کا لقب ہے، جو بنی اسرائیل کے ذکر میں تورات اور قرآن دونوں کتابوں میں بکثرت آیا ہے، اور قرآن پاک میں ۷۴ مرتبہ مذکور ہوا ہے۔

امام طبری اور قاضی بیضاوی سورہ بقرہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ایرانیوں اور رومیوں کے حکمرانوں کا لقب کسریٰ اور قیصر تھا، اسی طرح عمالقہ کے فرمانروا فرعون کے لقب سے پکارے جاتے تھے، سیبویہ اور جوالیقی بھی فرعون کو عجمی کلمہ تسلیم کرتے ہیں، اور خفاجی نے بھی اسے معرب بتایا ہے، اسی طرح راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ فرعون عجمی نام ہے، لیکن ان فضلاء میں سے کسی نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ اس لفظ کے لغوی معنے کیا ہیں اور اس کی اصل صورت کیا تھی۔

مغربی فضلاء کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم مصری اپنے حکمرانوں کو "پرعو" (Per-ʽo) کے لقب سے پکارتے تھے، پرعو کے لفظی معنے "دو ان عالی" ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس لفظ نے ایک اصطلاحی صورت اختیار کر لی اور یہ لفظ مصری حکمرانوں کا مخصوص لقب بن گیا، فرعون کا لفظ اسی مصری کلمہ "پرعو" کی عبرانی صورت ہے، جو عبرانی کے توسط سے عربی میں بھی مروج ہوئی، تاریخی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے نکلے تو اس لفظ کو اپنے ساتھ لائے جو بعد میں فرعون کی صورت میں تورات میں مستعمل ہوا، اور اس کے بعد عربی میں منتقل ہوا۔

عربوں نے اپنے قواعد لسانی کے مطابق فرعون کی جمع فراعنہ بنالی، اور اس سے کچھ مشتقات بھی بنائے ہیں، مثلاً تفرعُن بمعنے تکبر و تمرد۔

انگریزی میں فرعون کو Pharoah لکھتے ہیں۔

۱۲- **فردوس** :- فردوس کے لغوی معنی باغ ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر اس سے جنت یا بہشت بریں مراد لیتے ہیں،

عربوں نے فردوس کی جمع فرادیس بنالی ہے، اور اہل شام اپنے بستانوں اور انگور کے باغات کو فرادیس کہتے ہیں،

فردوس کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ آیا ہے، سورۃ الکہف میں ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	یعنی بیشک جو لوگ ایمان لائے اور
الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ	انھوں نے نیک کام کیے، انکی مہمانی کیلیے
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا	فردوس کے باغات ہیں۔

پھر سورۃ المومنون میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ	یعنی جو لوگ فردوس کے وارث ہونگے
ھم فِیْھَا خَالِدُوْنَ	وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

علمائے لغت میں جوہری، مجد الدین فیروز آبادی اور ابن منظور وغیرہ تمام فضلاء اس بات پر متفق ہیں کہ فردوس کے لغوی معنے بستان یعنی باغ کے ہیں لیکن اس کے اصل ماخذ کے بارے میں ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، فیروز آبادی اور خفاجی کا قول ہے کہ فردوس عربی لفظ ہے، اس کے برعکس اکثر علمائے لغت کی رائے ہے کہ عجمی ہے، لیکن اس سوال کے جواب میں کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے، مختلف اقوال ہیں، عکرمہ نے اسے حبشی بتایا ہے، اور مجاہد سے منقول ہے کہ فردوس رومی کلمہ ہے، ان کے برعکس متعدد علماء مثلاً ثعالبی (فقہ اللغہ) اور جوالیقی (کتاب المعرب) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ یونانی ہے، اور امام سیوطی نے اتقان اور مزہر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے تعجب ہے کہ

ان علماء میں سے کسی نے فردوس کے ایرانی الاصل ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا،

اقوال بالا کے برخلاف عصر حاضر کے محققین کی رائے ہے کہ اگرچہ فردوس کا لفظ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے لیکن اس کی اصل قدیم ایران سے ہے۔ زرتشتیوں کی قدیم ترین مذہبی کتاب اوستا میں یہ لفظ "پیری دائزہ" کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اس کے معنی حدیقہ کے ہیں، یونانی مورخ زینوفون (Xenophon) نے (جس کا سنہ پیدائش ۴۳۰ قبل مسیح ہے، اور جس نے ایران کی جنگوں میں حصہ لیا تھا) اس لفظ کو شاہان ایران کے باغات کے لیے استعمال کرکے یونانی میں رائج کیا، اس کے بعد یہ لفظ تورات کے یونانی ترجمہ میں بھی منتقل ہوا، جو تیسری صدی قبل مسیح میں مصر کے یونانی فرمانروا بطلیموس (Ptolemy) کے ایماء پر اسکندریہ میں تیار ہوا تھا، پھر اس لفظ نے یونانی کے توسط سے مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں رواج پایا، اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ عربی میں آرامی کے ذریعہ سے آیا ہے۔

یونانی میں اس لفظ کا املا Pradeisos کرتے ہیں اور لاطینی میں Paradisus۔ انگریزی لفظ Paradise اسی لاطینی کلمہ سے ماخوذ ہے یورپ کی مختلف زبانوں میں فردوس کے لیے جتنے الفاظ آئے ہیں وہ سب کے سب یونانی اور لاطینی کلمات پر مبنی ہیں، ان الفاظ کے باہمی تعلقات ذیل کے اندراج سے ظاہر ہوں گے۔

Avestic : Peri-daesa (= حدیقہ)

Greek : Paradeisos — Pahlavi

Latin : Paradisus — Aramaic

Arabic : فردوس

French : Paradis — Engl : Paradise — German : Paradies
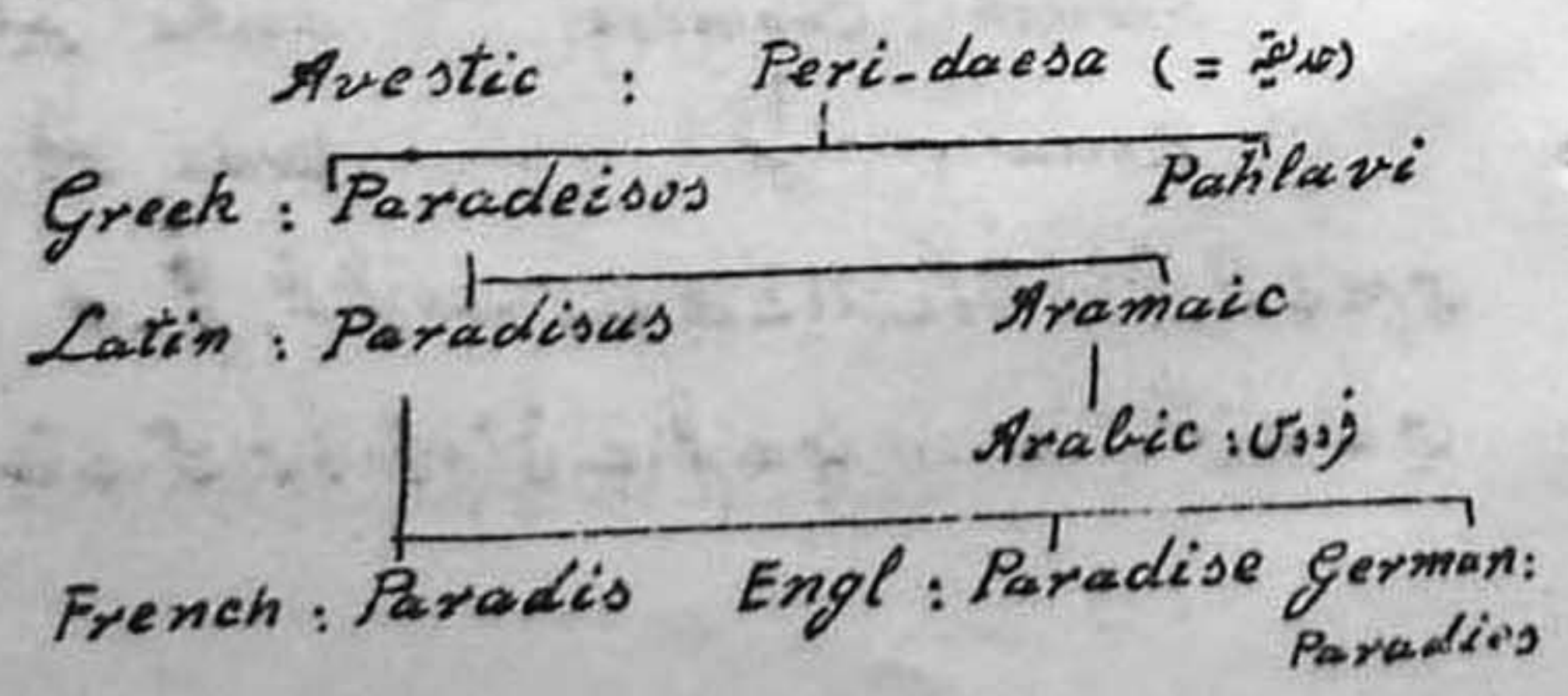
۱۳۔ **قمیص** ۔ بمعنے کرتا یا پیراہن، خصوصاً وہ زیر جامہ جو کتان یا سوت سے تیار کیا جائے۔

قمیص کا لفظ غلاف کے معنی میں بھی مستعمل ہے، مثلاً قمیص الکعبہ اور قمیص القلب۔

علمائے لغت نے قمیص کو عربی قرار دیا ہے، چنانچہ جوالیقی، سیوطی اور خفاجی میں سے کسی نے بھی اسے معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا، گویا یہ لفظ ان کے نزدیک خالص عربی ہے۔

قمیص کا لفظ قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے، لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صرف حضرت یوسفؑ کے قصہ کے سلسلہ میں مستعمل ہوا ہے۔

مغربی محققین کی رائے ہے کہ قمیص لاطینی کلمہ Camisia سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سوتی کرتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب رومی تاجر پانچویں صدی میں شام میں آئے تو ان کے ذریعے یہ لفظ شام میں رائج ہوا، پھر عربوں کے استعمال میں آیا،

فرانسیسی لفظ شمیز (Chemise) بھی اسی لاطینی کلمہ سے مشتق ہے۔ شمیز وہ ہلکا سا سوتی زیر جامہ ہے، جو خواتین اپنے لباس کے نیچے پہنتی ہیں۔ قمیص اور شمیز کی اصل ایک ہے، لیکن وہ ہمارے ہاں دو مختلف راستوں سے آئے ہیں، اس لیے ان کے مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے:

Late Latin : Camisia

French : Chemise　　Arabic قمیص

Urdu : شمیز　　Urdu قمیص

۱۴۔ **قلم** ۔ قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جسے نے یا نیزے کو تراش کر تحریر کے لیے کام میں لایا جاتا ہے، جمع اس کی اقلام آتی ہے، قلم سے چند اور الفاظ بھی مشتق ہوئے ہیں،

مثلاً قُلامہ وہ تراشہ ہے جو قلم تراشتے وقت نکلتا ہے، اور مِقْلَمَہ "قلمدان" کو کہتے ہیں۔

قلم کے اصلی لغوی معنی 'نے' یا نیزہ ہے، جسے پنجابی میں کانا اور انگریزی میں Reed کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ القلم الیراعۃُ یعنی قلم کے معنی نیزہ ہے، دوسرے معنی بعد میں پیدا ہوئے۔

قلم کا لفظ بعض اوقات رسم الخط کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ابن الندیم بغدادی نے اپنی فہرست کے ابتدائی باب میں جہاں مختلف قوموں کے خطوط (Scripts) کا ذکر کیا ہے، وہاں قلم کا لفظ رسم الخط کے لیے استعمال کیا ہے، مثلاً حمیر کے خط کو "القلم الحمیری" لکھا ہے، اور سریانی رسم الخط کو "القلم السریانی" کہا ہے۔

قلم کا لفظ عربی کے علاوہ دیگر سامی زبانوں مثلاً آرامی، سریانی اور حبشی میں بھی موجود ہے۔

فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں بھی اسی معنی میں مروج ہے اور غالباً عربی سے ماخوذ ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قلم کا لفظ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی موجود ہے، چنانچہ یونانی میں اُسے Kalamos اور لاطینی میں Calamus لکھتے ہیں، یونانی کلمہ کے آخر میں جو os ہے وہ اس کے مرفوع ہونے کی علامت ہے، قیاس چاہتا ہے کہ یہ لفظ لاطینی میں یونانی سے آیا ہے، کیونکہ رومیوں نے اپنے اکثر علوم یونانیوں سے حاصل کیے تھے، یونانی اُن سے بلحاظ زمانہ قدیم تھے، اور علمی لحاظ سے بھی اُن پر فوقیت رکھتے تھے،

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ قلم کا لفظ سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے،

جس کا املا بصورت Calamas کر سکتے ہیں، اور سنسکرت میں اس لفظ کے معنی بھی وہی ہیں جو عربی اور دیگر زبانوں میں ہیں، یعنی

(۱) نے یا نیزہ (Reed)

(۲) لکھنے کا آلہ جو نے سے بنایا جاتا ہے۔

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ قلم کا لفظ بہت سی سامی اور آریائی زبانوں کا مشترکہ کلمہ ہے، اتنی کثیر اور اہم علمی زبانوں میں اس لفظ کا وجود ایک قابلِ غور امر ہے، جو محض توارد اور توافق نہیں ہو سکتا، اسی کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس قوم یا ملک کی زبان میں شروع ہوا اور باقی قوموں یا زبانوں میں کب اور کیسے پھیلا، مغربی علماء کا قول ہے کہ اس کی اصل یونانی ہے، لیکن یہ قول مزید تحقیق اور تصدیق کا محتاج ہے۔

ہر حال قلم کے لیے یہ شہرت کیا کم ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلی وحی میں استعمال ہوا ہے، جو رسول اکرم (صلعم) پر غارِ حرا میں نازل ہوئی تھی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ	(اے نبی) پڑھ ساتھ نام اس پروردگار
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اقْرَأْ	کے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا اور
وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ	انسان کو خونِ بستہ سے بنایا، پڑھ اور
بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ	جان لے کہ تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے،
يَعْلَمْ ۔	جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور
	انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ہی "سورۃ القلم" ہے، جس میں قلم کی

قسم کھائی گئی ہے،

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ	ن اور قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو
مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ	وہ لکھتے ہیں، اپنے پروردگار کی مہربانی
	سے تو دیوانہ نہیں ہے۔

سورہ لقمان میں قلم کا لفظ بصورت جمع بھی آیا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ	اور اگر جس قدر زمین میں درخت ہیں،
شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ	قلمیں بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی
مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ	اور اس کے بعد سات سمندر اس میں اور
كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ	ملا دیے جائیں، تب بھی خدا کی باتیں
حَكِيمٌ	ختم نہ ہوں گی۔

قلم کی تعریف و توصیف میں ادیبوں اور شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے، ناظرین کی خدمت میں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:-

اذا افتخر الابطال یوماً بسیفهم	وعدّوه مما یکسب المجد والکرم
کفی قلم الکتّاب فخراً ورفعةً	مدی الدهر ان الله اقسم بالقلم
یا ناظر الصنع انظر صنع کاتبه	لقد ابان یواقیتاً من القلم
حسناء کحلاء لا تحصی محاسنها	نفسی فداها لحسنِ الخط والرقم

۱۵- **کافور**- کافور سفید رنگ کا ایک شفاف اور خوشبودار مادہ ہے، جو تاثیر میں سرد اور مسکّن ہے، دوسرے خواص کے علاوہ کرم کش بھی ہے، اسلیے بطور antiseptic بھی استعمال ہوتا ہے، اور دواؤں میں بھی ڈالا جاتا ہے۔

کافور ایک درخت کی لکڑی سے حاصل ہوتا ہے، جو مشرقی ملکوں کی خاص پیداوار ہے، اور چین اور جاپان کے علاوہ جزائر فارموسا اور بورنیو میں بھی پایا جاتا ہے، عرب قرون وسطیٰ میں جن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، اُن میں کافور بھی شامل تھا،

کافور کا ذکر قرآن مجید (سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یوں آیا ہے:-

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن — یعنی نیک لوگ بیشک ایسے جام

كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا — پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی،

اگرچہ لسان العرب میں کافور کو خالص عربی لفظ بتایا گیا ہے، لیکن ثعالبی، جوالیقی، سیوطی اور خفاجی سبھی نے لکھا ہے کہ کافور فارسی سے ماخوذ ہے، پہلوی میں اس لفظ کی صورت کاپور تھی، اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کافور پہلوی کاپور کا معرب ہو۔

دوسری مشرقی زبانوں میں کافور کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس بحث میں ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، مثلاً سنسکرت میں کرپور، ہندی میں کپور اور ملایا اور جاوا کی زبانوں میں کاپور ہے، اور چونکہ کافور مشرق بعید کی پیداوار ہے، اور عرب مصنفین کے بیان کے مطابق عرب تاجر کافور جاوا اور سماٹرا سے حاصل کرتے تھے، اس لیے اغلب یہ ہے کہ عربوں نے جہاں کافور ان ملکوں سے حاصل کیا، اس کا نام بھی انہی ملکوں کی زبان سے براہ راست اخذ کیا ہو،

پروفیسر جیفری لکھتے ہیں کہ عربوں نے کافور کا لفظ غالباً سریانی سے لیا ہے۔ (جو سوریہ یعنی شام والوں کی زبان تھی) کافور کا لفظ سریانی میں بھی موجود ہوگا۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عرب ایک ایسی چیز کا نام ایک شمالی

ملک کی زبان سے لیں، جو در اصل مشرق بعید کی پیداوار ہے، اور جس کے ساتھ انکے براہ راست تجارتی تعلقات قائم تھے،

معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ایران یا کم از کم دربار ایران میں کافور کی بہت کھپت تھی، عربی مورخوں نے لکھا ہے کہ جب عربوں نے ایران کے دارالسلطنت مدائن کو فتح کیا تو انھیں وہاں کے شاہی محل میں کافور کی بہت بڑی مقدار ملی، اور اسلامی لشکر کے بعض بدویوں نے اسے نمک سمجھ کر اپنی ہنڈیوں میں ڈال لیا۔

۱۶- مسک۔ مسک کا لفظ فارسی مُشک کا معرب ہے۔

مُشک ایک خوشبودار مادہ ہے، جو ایک خاص قسم کے ہرن کے نافہ سے حاصل ہوتا ہے یہ ہرن عرب میں نہیں پایا جاتا، اس لیے عرب لوگ مشک باہر کے ملکوں سے حاصل کرتے تھے،

مسک کا لفظ قدیم جاہلی شعراء کے کلام میں پایا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی جنت کی نعمتوں کے بیان میں ایک مرتبہ آیا ہے، سورۃ التطفیف میں ہے:

يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ — ان کو شراب خالص سربمہر پلائی جائیگی

خِتَامُهُ مِسْكٌ — جس کی مُہر مُشک کی ہوگی۔

ثعالبی، جوالیقی، سیوطی، خفاجی اور ابن منظور (صاحب لسان العرب) سبھوں نے اس لفظ کو معرب بتایا ہے، جس کی اصل فارسی ہے، پہلوی میں اسکی صورت مُشک ہے، اور سنسکرت میں مُشکا، اور غالباً یہی مشکا پہلوی مشک کی اصل ہے، بہرحال عرب لغت نویسوں کے بیان کے مطابق یہ لفظ فارسی (یعنی پہلوی) سے آیا ہے۔ مُشک کا لفظ کم وبیش تبدیلی کے ساتھ یونانی، لاطینی اور یورپ کی دیگر

متعدد زبانوں میں موجود ہے، اور غالباً پہلوی سے ماخوذ ہے،

مشک کو فرانسیسی میں musc کہتے ہیں، اور انگریزی میں musk اور ہرن کی جس قسم سے مشک حاصل ہوتا ہے اسے musk-deer کہتے ہیں۔

۱۷- آدم- عربی کلمہ ہے بمعنے ابوالبشر- تورات اور قرآن پاک کی رو سے آدم پہلا بشر ہے جسے خداوند کریم نے پیدا کیا تھا،

آدم کا لفظ عربی کے علاوہ کنعانی (یعنی فنیقی) عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی موجود ہے،

آدم کا لفظ سب سے پہلے تورات کی سفر التکوین (یعنی کتاب پیدائش) میں استعمال ہوا، اور بعد ازاں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں کم از کم پچیس ۲۵ مرتبہ آیا ہے،

ابومنصور جوالیقی نے اپنی کتاب المعرب میں آدم کے لفظ کو عربی بتایا ہے، لیکن علامہ زمخشری (اور قاضی بیضاوی) نے اسے عجمی کلمہ قرار دیا ہے، امام راغب اصفہانی نے لفظ آدم کے اشتقاق کے بارے میں متعدد اقوال روایت کیے ہیں، اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ آدم اُدمة سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگت کے ہیں، اور اس قول کو قبول کر لیا جائے تو آدم کا وزن (اسود اور احمر کی طرح) اَفعَل قرار پائے گا۔

عربی میں آدم کا لفظ صرف اسم علم کے طور پر استعمال ہوا ہے، لیکن عبرانی اور کنعانی زبانوں میں عام انسانوں کے لیے بھی آیا ہے۔

آدم کا لفظ مغربی قوموں نے بھی اسم علم کے طور پر اختیار کیا ہے، اور ان کے ہاں ذیل کی مختلف صورتوں میں پایا جاتا ہے:-

English, German, French & Danish	Adam
Italian	Adamo
Spanish	Adan
Portuguese	Adão

سیاست میں اسلام

(۳)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

جنوب مشرقی ایشیا

جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی شکل مشرق وسطی سے کافی حد تک مختلف ہے، یہاں مسلمان ایک بہت وسیع و عریض خطے میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، فلپائن اور اس کے گرد و نواح کے علاقے اور جمہوریہ سنگاپور شامل ہیں، اس خطہ کی مسلم آبادی کا اندازہ ۹ کروڑ سے زائد لگایا جاتا ہے[1]، یہ علاقہ درمیان میں سمندروں کے حائل ہونے کے باعث مسلمانوں کے خاص مرکزوں سے الگ تھلگ رہا ہے، دنیائے اسلام میں اس کا اضافہ تقریباً چودھویں صدی میں ہوا، جب مسلم تہذیب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، یہاں اسلام کی آمد بہت سست رفتاری کے ساتھ ہوئی لیکن اس کی اشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، کچھ علاقے تو ایسے ہیں جہاں کے باشندے ابھی حال ہی میں مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور اب

---

[1] مترجم۔ فاضل مقالہ نگار نے جنوب مشرقی ایشیا میں صرف پانچ ہی ملکوں کا ذکر کیا ہے، حالانکہ ایشیا کا یہ خطہ اٹھارہ[18] ممالک پر مشتمل ہے، اور اسکی مسلم آبادی مجموعی طور پر بیس کروڑ سے بھی زائد ہے جن ملکوں کو مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے ان میں ویٹ نام (مسلمان ۲۶ لاکھ) لاؤس (ایک لاکھ تیس ہزار) کمبوڈیا (چار لاکھ) برما (اٹھارہ لاکھ پچاس ہزار) شمالی بورنیو (۲ لاکھ ۷۰ ہزار) پرتگالی تیمار (ایک لاکھ پچاس ہزار) سراورک (۲ لاکھ ۳۰ ہزار) برونئی (۸۴ ہزار) بھارت (۶ کروڑ) نیوگنی (۵ لاکھ) پرتگالی ہند (۲ لاکھ ۵۰ ہزار) سیلون (۷ لاکھ) اور پاکستان (۹ کروڑ) شامل ہیں، ان تمام ممالک کے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات کا جائزہ لیے بغیر جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں کی پوزیشن مکمل طور پر واضح نہیں ہوگی۔ "ن"

آہستہ آہستہ انڈونیشیا کے سب سے بڑے جزیرہ بورنیو، مغربی آئرین اور کالیمنتان کے علاقوں میں بسنے والی غیر مسلم اقلیت بھی اسلام سے متاثر ہو رہی ہے،

اس خطہ کو دنیائے اسلام کا سرحدی علاقہ کہا جا سکتا ہے، دور دراز کے اسلامی ممالک خصوصاً مصر و پاکستان کے اسلامی خیالات نے یہاں کے لوگوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا ہے، اس خطہ میں ایک طرف تو وہ طبقہ دکھائی دیتا ہے جو اسلام کی پیروی میں نہایت متشدد ہے دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس نے بعض اسلامی تعلیمات کو ناقابلِ عمل تصور کر کے ان میں ترمیم کر لی ہے، اس کے علاوہ یہاں اسلامی اصولوں کے ساتھ مقامی رسم و رواج کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، یہ رسم و رواج مسلم تہذیب کے اثرات سے پہلے ہندو سوسائٹی یا بے دین فرقوں کی دین ہیں، اس لیے اس خطہ کے مختلف علاقوں میں اسلام کی شکل مختلف ہے، لیکن تمام مسلم فرقوں کے درمیان سیاسی اور سماجی ہم آہنگی پورے طور پر پائی جاتی ہے، اس کا اہم سبب یہ ہے کہ یہاں ان کا واسطہ تقریباً ایک کروڑ چینیوں سے برابر پڑتا رہتا ہے، جو ایک طاقتور اقلیت کی شکل میں گزشتہ ایک صدی سے ہر حیثیت سے ترقی کر رہے ہیں، اور اس علاقہ کی معاشیات پر ان کا پورا قبضہ ہے، ان چینیوں کی وجہ سے اسلام کو اس خطہ میں ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے، یہاں کے مسلمانوں میں اس چیلنج کا احساس تو ضرور ہے لیکن اس خطرہ کی شدت کو انھوں نے پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے،

جنوب مشرقی ایشیا میں مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو تعلیمی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ان سے برتر ہے، یہ لوگ اپنے سیکولر اور مادہ پرستانہ نظریات کے سبب دوسرے اہل مذاہب سے معاشی امور کے علاوہ کسی اور شعبۂ حیات میں کسی طرح کا واسطہ نہیں رکھتے، حالانکہ وہاں کنفیوشس کے نظریات پر لکچر ہوتے اور قمری تیوہار منائے جاتے رہتے ہیں، چینی اپنے خاندان کی مادی ترقی کے علاوہ مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ملایا اور انڈونیشیا کے مسلمان چینیوں کے ان خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ خیالات سے بہت دور ہیں، لیکن ان کو بادل ناخواستہ ان بے دین چینیوں سے تعلقات قائم رکھنے

پڑتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس خطہ کی تین اہم حکومتوں یعنی انڈونیشیا، متحدہ جمہوریہ ملیشیا اور سنگاپور کی معاشیات پر ان چینیوں کا زبردست قبضہ ہے، جو وہاں کی ایک بڑی اقلیت شمار ہوتی ہے جسکی تعداد اس خطہ میں ۳۵٪ ہے، بہت سے اہم تجارتی مرکزوں میں تو وہ اکثریت میں ہیں، کوالالمپور، جزائر مالوکا اور پنانگ میں خاص طور سے ان کی اکثریت ہے، خاص شہر سنگاپور میں وہ ۷۵ فیصدی ہیں، اور ایشیا میں صنعتی ترقی کے اعتبار سے جاپان کے بعد سنگاپور کا دوسرا نمبر ہے، اور ملائشیا اور انڈونیشیا بھی اس کے تعاون اور صنعتی اشتراک کے ضرورت مند رہتے ہیں،

اس خطہ کے سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، ملیشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور کی حکومتیں سیاسی طور پر چینیوں کی تعداد اور طاقت سے کافی حد تک متاثر ہوتی رہی ہیں، ان چینیوں نے اندرون ملک ملایائی اور انڈونیشی عناصر سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے، وہ طبعاً انقلابی اور تخریب پسند واقع ہوئے ہیں، اور ان کو سمندر پار سرخ چین کی مدد پر بھی بھروسہ ہے، ملایا اور انڈونیشیا کی ثقافت کو ان چینیوں سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تدارک کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ قطعی ناکافی ہیں، اس لیے ملیشیا کے اہم علاقوں میں چینی اکثریت نے شہریت اور حقوق رائے دہندگی کے قوانین کو کافی متاثر کیا، چینیوں کی اس اکثریت نے دینی امور سے متعلق مرکزی وزارت کے قیام کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کی ہیں،

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان ملیشیا اور سنگاپور کا جو فیڈریشن وجود میں آیا ہے، اس کا مقصد سیاسی، مذہبی اور قومی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، بعد میں شمالی بورنیو کے برطانوی علاقے سراوک اور صباح بھی اس فیڈریشن میں شامل کر لیے گئے، تاکہ چینی اکثریت والے علاقے سنگاپور میں ملایائی باشندے اقلیت میں نہ آ جائیں، لیکن اگست ۶۵ء میں سنگاپور نے اس فیڈریشن سے اپنی علٰحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا جس سے ان دونوں ٹکڑوں میں ہم آہنگی قائم رہنا ناممکن ہو گیا۔

اس دوران میں انڈونیشیا جو ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا تھا، مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی مسائل سے دوچار رہا، اس کی مذہبی و ثقافتی حالت ملیشیا یا سنگاپور سے بہت مختلف تھی، ان دونوں ملکوں میں ملایائی ہونے کا مطلب مسلمان ہونا تھا، اور اس رشتہ سے ان کے لیے تمام قانونی پابندیوں کا احترام لازمی تھا، اس فیڈریشن کا سرکاری مذہب اسلام تھا، اور گو آئین کی بعض دفعات میں مذہبی آزادی کی صریح ضمانت دی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگادی گئی ہے کہ حکومت مسلمانوں کو کسی اور مذہب کی طرف راغب کرنے والی تحریکوں پر قانونی پابندی عائد کرسکتی ہے"، ملایائی مسلمانوں کی کمزور معاشی حالت کا اندازہ ان تحفظات سے ہوسکتا ہے جو ملازمتوں اور محفوظ زمینوں کے بارے میں ان کو "خاص حقوق" کے طور پر دیے گئے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ فیڈریشن سے علیحدہ ہوجانے والے سنگاپور میں بھی پندرہ فیصد ملایائی اقلیتوں کے لیے یہ "حقوق خاص" اب تک قائم ہیں، لیکن انڈونیشیا میں صورت حال اس سے مختلف ہے، وہاں تاریخی حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ انڈونیشی اور مسلمان دو نیم مترادف سمجھے جاتے ہیں، مثلاً جاوا کے باشندے ہندو اور بودھ تہذیب اور اس کی روایات کے پیرو اور سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت[۱] کے ماننے والے ہیں، جزیرہ بالی ہند و تہذیب کا ایک جدید نمونہ ہے، کچھ علاقوں میں تھوڑے سے عیسائی بھی ہیں، یہاں

۱؎ مترجم - سری وجایا، سلینڈرا اور مجاپہت انڈونیشیا کی قدیم بودھ سلطنتوں کے نام ہیں، جن کا زمانہ اندازاً ساتویں اور آٹھویں صدی بتایا جاتا ہے، ۸۲۰ء میں سلینڈرا نے سری وجایا کی سلطنت کو فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا، یہ وسطی جاوا میں پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح مجاپہت بھی انڈونیشیا کی اہم ترین سلطنت تھی جس کا بانی راڈن وجایا بیان کیا جاتا ہے، اس سلطنت کا زمانہ ۱۲۹۳-۱۵۲۰ء ہے، یہ انڈونیشیا میں ہندوؤں کی سب سے بڑی سلطنت تھی، اور اس کی شکست کے بعد ہندو دور حکومت ختم ہوگیا اور مسلمان سلطنتوں کے قیام سے انڈونیشیا کی تاریخ میں دور عظیم کا آغاز ہوا۔ "ن"

چینی باشندے معاشی طور پر کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، تعداد میں وہ مجموعی آبادی کا محض پانچ فیصدی حصہ ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ انڈونیشیا جہاں بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۱۳ء میں اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کے فروغ اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایک نئی جماعت "شرکت اسلام"[۱] کا قیام عمل میں آیا تھا، وہ سوکارنو اور حتا کے دور میں کافی حد تک سیکولر ہوگیا، آزادی کے بعد انڈونیشیا میں اسلامی اور بے دین طاقتوں کے درمیان برابر تصادم ہوتا رہا، دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر انڈونیشیا نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا، اور نظام حکومت کے لیے "پنچ شیلا" (اصول پنجگانہ) کو اپنایا جس میں سرفہرست خدا پر ایمان کو اہمیت دی گئی ہے، کوئی ایسی بات جس کا اسلام سے تعلق ہو اس میں شامل نہیں تھی،

آج ملیشیا میں ایک قومی زبان کی تحریک جس زور و شور کے ساتھ چل رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں دونوں قوموں کی شیرازہ بندی کی کوششوں اور اسلام کو اپنی حفاظت کا قلعہ بنانے کے تجربے دونوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن انڈونیشیا میں مختلف النوع سوسائٹیوں کے باوجود ایک مشترک قومیت کا جذبہ مضبوط ہوتا جارہا ہے، ملیشیائی

۱؎ مترجم - جماعت "شرکت اسلام" کا قیام حاجی عمر سعید کے زیر صدارت ۱۹۱۳ء میں اس وقت عمل میں آیا تھا جب ولندیزیوں نے "شرکت گانگ اسلام" کو غیر قانونی جماعت قرار دیدیا تھا، شرکت اسلام کے بنیادی مقاصد یہ تھے: (۱) مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف کرانا (۲) غیر اسلامی طرز معاشرت اور فرسودہ رسم و رواج کو مٹانا (۳) اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینا (۴) اہل ملک کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کیلئے کام کرنا (۵) صنعت و تجارت کو فروغ دینا (۶) عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا۔

شرکت اسلام کے قیام سے انڈونیشیا میں قومی بیداری کے اہم ترین باب کا آغاز ہوا، اور اسکی کوششوں سے ولندیزی سامراج کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں اور صرف ۳۵ سال کے مختصر عرصہ میں انڈونیشیا نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ "ن"

ارباب اقتدار کی بہ نسبت انڈونیشی حکمراں دینی امور میں اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں، چنانچہ انڈونیشیا میں آزادی کے بعد سے مذہب سے زیادہ سیاست کو اہمیت دی گئی ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہاں مذہبی احساس مردہ یا ختم ہو چکا ہے، ۱۹۴۸ء میں جماعت دار الاسلام[1] کی گوریلا سرگرمیاں، ماشومی[2] (مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا) کی تحریک اور اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف انڈونیشی مسلمانوں کے اقدامات وہاں کی اسلامی زندگی اور اس کی آب و تاب کا بین ثبوت ہیں، بلاشبہہ ماشومی ایک سیاسی تحریک ہے، جو دوسرے مسلم ممالک کی طرح اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہے، مگر اسلام کا یہ مصرف ملیشیا کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

---

[1] مترجم۔ "دار الاسلام" انڈونیشیا کی اسلامی جماعتوں میں سب سے زیادہ کٹر، انتہا پسند اور جنگجو جماعت شمار ہوتی ہے، اس کا نصب العین اسلامی مملکت کا قیام ہے، ماشومی کے برخلاف یہ جماعت دہشت پسندی، جنگ اور خونریزی کی قائل تھی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلیے اسی قسم کے تمام وسائل سے کام لینا جائز تصور کرتی ہے، دار الاسلام کے رہنما کارتو سویریو (Kartosoewirjo) تھے لیکن بعد میں وہ اس سے بے تعلق ہو گئے۔ (ن)

[2] مترجم۔ ۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر محمد سوکیمان نے مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا (Madjelis Sjuro Muslimin Indonesia) کے نام سے ایک نئی اسلامی تنظیم قائم کی جس کا مختصر نام ماشومی (Masjumi) ہے اور وہ اسی نام سے مشہور ہے، سوکیمان اور حامی اسلام دوسرے رہنماؤں نے اس تنظیم سے پورا فائدہ اٹھایا، اور مسلمانوں کو متحد کر کے آزادی اور اسلامی مملکت کی راہ ہموار کرنے لگے، اس تنظیم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتیں اور غیر سیاسی کل ادارے اس تنظیم میں شامل ہو گئے، اور چند مہینوں کے اندر یہ انڈونیشیا کی سب سے بڑی اور پورے ملک کی نمائندہ جماعت بن گئی، اس تنظیم میں جن جماعتوں نے انضمام کر لیا تھا، ان کے نام یہ ہیں، پارٹی اسلام انڈونیشیا، شرکت اسلام انڈونیشیا، پے تندار پارسیان شرکت اسلام کیدو دا۔ جمعیۃ المحمدیہ اور نہضۃ "(ن)"

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم معاشرہ کا ایک نمایاں جزو چینی باشندے ہیں، اور یہی چیز انڈونیشیا میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مسائل کا سبب بنی ہے، ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں مختلف نکلا، ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک ڈاکٹر سوکارنو نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کئی ناکام کوششیں کیں، اور اسی کے سہارے انھوں نے ملک کے عوام کو ملکی مسائل کی سنگینی کا احساس نہ ہونے دیا، لیکن ان دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان جو نیم مسلح کشمکش چل رہی تھی، وہ اب کم ہوتی نظر آتی ہے۔

اب توقع ہے کہ کچھ عرصہ میں ایک متحدہ ملایائی، انڈونیشیائی ثقافت وجود میں آئے گی، اس سلسلہ میں امید کی ایک شعاع اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ حال میں ان دونوں ملکوں اور فلپائن کو ملا کر "نئی انڈو ملیشیا" (فلپائن اور انڈونیشیا کا فیڈریشن) قائم کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے، اور وہ پرانا جذبہ جس کے ذریعہ ہند چینی کے درمیانی علاقوں کو ایک مشترک حکومت "نوسنترا" مانا جاتا تھا، پھر سے عود کر آیا ہے، اس کا ثبوت اس پرجوش استقبال سے ملتا ہے، جو ملیشیائی لیڈروں نے ان انڈونیشی فوجی افسروں کا کیا ہے، جو حال ہی میں سیاسی ناکہ بندی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے کوالالمپور پہنچے تھے،

لیکن سوال یہ ہے کہ اس اتحاد کی بنیاد کیا ہو گی؟ اور ان ملکوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوں گے؟ اس میں شبہہ نہیں کہ حالیہ چند برسوں میں انڈونیشیا کے جذبۂ دشمنی نے ملایا کو اچھی نظر سے دیکھنے کا جذبہ ختم کر دیا ہے، خاص طور سے انڈونیشیا اپنے سیکولر نظریات اور مشترک کلچر کے ذریعہ دنیا میں اپنا جو مقام بنا رہا تھا

اس کی بنا پر اس نے ملائشیا کی مسلم پرستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا، ملائشیا کو انڈونیشیا کے وسیع ثقافتی اور لسانی خزانے سے بہت کچھ لینے کی ضرورت ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دونوں ملکوں میں تمدنی اثرات کی مکمل طور پر لین دین ہو تو ان میں بہت خوشگوار تعلقات پیدا ہونے کی امید ہے، لیکن ایک ملک میں مذہبی جذبہ کی شدت اور دوسرے میں سیکولر نظریات کی تائید (گو زبانی ہی سہی) ایک ایسا ٹکراؤ ہے جو دونوں ملکوں کے تعلقات میں ہمیشہ حائل رہے گا۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے خونی انقلاب کے بعد انڈونیشیا میں قومیت کا جذبہ انتہائی شدت سے ابھر آیا ہے، جس کا نشانہ عام طور پر چینی اقلیت اور خصوصاً سرخ چین بنا، اس جذبہ کے ملیشیا میں بھی پھیل جانے کا قوی امکان ہے، جہاں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء تک کمیونسٹ تنظیموں کی بغاوت میں مقامی چینیوں نے نمایاں حصہ لیا تھا، سیاسی ناکہ بندی سے پہلے ان دونوں ملکوں (انڈونیشیا اور ملیشیا) میں انتہا پسند مذہبی اور سیکولر تنظیموں میں مصالحت کی کوشش کی گئی تھیں؛ اور اب ان چینیوں کے خلاف ایک نئے قسم کی ناکہ بندی اور ایک نیا جہاد شروع کرنے کے لیے عوام کو اپنی طرف مائل کر لینا کچھ دشوار کام نہیں ہے، انڈونیشیا میں تو چینی اقلیت کے خلاف تشدد کے ایسے واقعات ہوئے کہ پیکنگ حکومت کو اس کے خلاف کئی بار احتجاج کرنا پڑا، انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں میں چینیوں کے خلاف جذبۂ مخاصمت پیدا ہونے کے کئی اسباب ہیں، وہ غیر ملکی ہیں، وہ نہ تو ان ملکوں کی سوسائٹی میں جذب ہو سکتے ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں، معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال ہیں، یا خود انتہا پسند کمیونسٹ ہیں یا ان کے معاون ہیں، سب سے بڑھکر یہ کہ وہ خدا

پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ارباب اقتدار اس سیاسی مسئلہ کا کوئی عام پسند حل نکال سکتے ہیں یا یہ فرقہ وارانہ کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی؟ ممکن ہو کہ دونوں ملکوں میں دبا ہوا مذہبی جذبہ شدت اختیار کر جائے، یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اگرچہ نیو گنی (بورنیو) کے ملیشائی علاقوں میں انڈونیشی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں، مگر کئی ہزار کمیونسٹ گوریلے اور انکے چینی بہی خواہ اب بھی جنگلوں میں روپوش ہیں، اگرچہ دونوں بازوؤں سے علیحدہ ہو جانے کے باعث ان کی حالت نازک ہے، ملیشیائی حکومت نے ان سے کہا ہو کہ وہ ہتھیار ڈال کر از سر نو زندگی کے میدان میں قدم رکھیں اور اگر وہ ملیشیا سے باہر جانے کے خواہشمند ہوں تو اس کا بھی معقول انتظام کر دیا جائے گا، لیکن اگر خود ٹنکو کو ملک بدر ہونا پڑا تو وہ کہاں جائیں گے؟

سنگا پور یا چین؟

اس نازک مسئلہ کا حل حکومت سنگا پور کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ باہر سے آنے والوں کے لیے سنگا پور ہی ایک مرکزی پناہ گاہ ہے، آج سراوک اور صباح میں باغیوں کے لیے جو اشتہارات گرائے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر وزیر اعظم لی کوان یو کا یہ بیان قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ

"سمندر پار چینیوں کی بہترین پناہ گاہ سنگا پور ہے"۔

مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں اس کا قوی امکان ہو کہ سنگا پور کی وسیع النظر پالیسی اور مختلف اقوام پر مشتمل وہاں کی مشترکہ سوسائٹی ان دونوں پڑوسی ملکوں پر بھی اثر انداز ہو گی، اور ان میں جذبۂ رواداری پیدا کریگی، سنگا پور کو چینی اقلیت کی پناہ گاہ سمجھنا بالکل ویسا ہی ہے، جیسے ڈیسفوراکے یہودیوں کے لیے اسرائیل ہو، ان چینیوں کا مسئلہ شمالی افریقہ کے ان یورپین باشندوں سے بہت مشابہ ہے جن کو ضرورت کے وقت اپنے ملک بھاگ جانے کی سہولت حاصل ہے، پھر بھی وہ بھاگتے نہیں، بلکہ ایک غیر ملک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے

بجے رہتے ہیں، بلا شبہہ چینیوں کا بھی اپنا ایک وطن ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی آبائی وطن واپس جانا پسند نہیں کرتا، اسرائیل کی تقلید میں ان چینیوں نے بھی اس علاقے میں اپنے لیے ایک علحدہ ٹکڑا منتخب کرلیا ہے، جو اقوام متحدہ (U.N.O) کا ممبر اور بین الاقوامی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک جزیرے کی حیثیت سے سنگاپور زیادہ دنوں تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کے قدرتی وسائل بہت محدود ہیں اور دشمن ملکوں کے سمندر اسکا احاطہ کیے ہوئے ہیں، لیکن اس موقع پر اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے جس نے سخت ترین دشواریوں کے باوجود اپنی معاشی طاقت کو کتنا مضبوط بنا لیا ہے، سنگاپور بھی اسی کے نقش قدم پر چل سکتا ہے، اور چینی ننیانگ کی سرمایہ کاری اور ذہنی صلاحیتوں سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس امکان کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سرخ چین ایمرجنسی کے وقت سنگاپور کو پوری پوری مدد دے سکتا ہے، چین ملیشیا کو نوآبادیاتی نظام کا طرفدار اور انڈونیشیا کو ترقی پسندی کا مخالف شمار کرتا ہے، اگر چینی حکمراں اپنی طاقت کے بل پر شرارت کرنا چاہیں، جیسا کہ انڈونیشیا میں ہو چکا ہے، تو اس کا انجام نہایت تباہ کن ہوگا، اگر ملیشیا اور انڈونیشیا کے متحدہ وفاق کو کبھی چین دشمنی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کا بھیانک انجام یہ ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کا عظیم مسلم معاشرہ ختم ہو کر رہ جائے، اس لیے جنوب مشرق ایشیا کے مسلمانوں کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے اسلامی ڈھانچہ کو مضبوط تر بنالے اور مسلم فرقہ کو زیادہ طاقتور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر چارلس ایف گیلاغر، مراکش)

وفیات

ڈاکٹر سید محمود

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے وطنی اور ملی دونوں جذبات بیدار ہوتے رہے ۱۹۰۹ء میں ایران کی تقسیم کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا، انگریزوں نے وہاں بلوجکیٹ فوج اتار دی، مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن دونوں نے اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لی، ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحبت میں برابر رہا کرتے تھے اس لیے وہ انہی کے ذریعہ سے ایران کے مشہور رہنماؤں میں مرزا یحییٰ اور آقا تقی وغیرہ سے ملتے رہے، پھر ایرانیوں کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا، پروفیسر براؤن نے اس جلسہ میں منظور کرانے کے لئے ایک تجویز مرتب کی، جس کو ڈاکٹر صاحب نے لیجا کر مسٹر بلنٹ کو دکھایا، انھوں نے دیکھ کر کہا یہ تجویز بے جان ہے، انگریزوں کی سخت مذمت کرو ان کو گالیاں دو، تب ہی ان پر اثر ہوتا ہے، پھر انھوں نے خود ہی ایک بہت ہی سخت تجویز مرتب کی، جلسہ میں جب یہ تجویز ڈاکٹر صاحب نے پیش کی تو پاس نہ ہو سکی، لیکن ایک دوسری تجویز میں سلطان ٹرکی اور امیر افغانستان سے ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی، اس تجویز سے بھی انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل مچ گئی، ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب کی اسلامی حمیت بھڑک اٹھی اور انھوں نے ترکوں کی مدد میں ایک جلسہ کرایا، جس میں انکی دعوت پر مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن بھی شریک ہوئے، اس میں مسٹر بلنٹ نے انگریزوں کے خلاف ایسی سخت تقریریں کیں کہ یہ بڑے سازشی ہیں، اٹلی کے ساتھ سازش میں شریک ہیں، اگر یہ چاہیں تو طرابلس سے اٹلی کی فوجیں واپس جا سکتی ہیں، جنگ بلقان کے موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی اسلامی غیرت ابھری، اس سلسلہ میں مسٹر بلنٹ نے

ان کو ایک طویل خط لکھا جس کو انھوں نے مولانا محمد علی کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں
شائع کردیا۔ وہ اپنے استاد کا بہت احترام کرتے، مگر بلقان کی جنگ کے سلسلہ میں ان کی
رائے سے اختلاف کیا۔ اسی طرح مسٹر بلنٹ کا خیال تھا کہ اگر خلافت ترکی کے بجائے عربوں
کے کسی ملک میں منتقل ہوجاتی تو زیادہ مفید ہوتی۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کے اس خیال
کو سیاسی مصلحتوں پر مبنی سمجھتے۔

ڈاکٹر صاحب نے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ مسٹر بلنٹ ہندوستان کی
سیاحت کے لیے بھی آئے تھے، وہ علی گڑھ پہونچے تو سرسید نے ان کی دعوت کی جس میں
ایک انگریز کلکٹر اور ایک انگریز جج کو اپنے دونوں طرف بٹھایا۔ مسٹر بلنٹ کو یہ انگریز نوازی
ناگوار گذری، اور اپنی ڈائری میں ان انگریزوں کا ذکر نامی کی حیثیت سے کرکے سرسید کے
متعلق لکھا کہ یہ غیر مخلص شخص (Insincere fellow) ہے۔ ڈاکٹر صاحب سرسید کے متعلق
یہ رائے پسند نہیں کرسکتے تھے اس لئے وہ خوش تھے کہ مسٹر بلنٹ نے آخر میں یہ رائے بدل
دی تھی۔ اور وہ سرسید کو مخلص سمجھنے لگے تھے، اس رائے کی تبدیلی میں یقیناً ڈاکٹر صاحب کا
بھی حصہ رہا ہوگا۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن کے بہت سے خطوط ڈاکٹر صاحب کے پاس
آخر وقت تک محفوظ رہے، انھوں نے ان کو اپنے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، جو انھوں
نے مشاہیر کے خطوط ان کے نام کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اب تک
شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے ان کی سیاسی سرگرمیوں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں
کی اور زیادہ تفصیلات معلوم ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قیام انگلستان ہی کے زمانہ میں رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے
لندن میں مسلم لیگ قائم کی تو ان کو اس کا جائنٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے ایک جلسہ میں

سر علی امام نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی تو انھوں نے اس کی تائید کی، اور پھر اس کے لئے
مختلف جلسے بھی کرائے، یہ بات جسٹس امیر علی اور سر آغا خاں کو پسند نہ آئی، ان سے ڈاکٹر صاحب
کا اختلاف بڑھا تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہوگئے۔ وہ اپنی نجی گفتگو میں کہتے کہ مجھکو اس وقت جداگانہ
اور مشترکہ انتخاب کی بحث بالکل فضول معلوم ہوتی، وہ ہر دم انگریزوں کی غلامی کا طوق ہندوستانیوں
کی گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے، اس لئے وہ کوئی ایسا جھگڑا پسند نہیں کرتے جس سے
ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوجاتا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں
کو جلد سے جلد اسلئے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کہ انکا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار ختم ہونے
کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں بھی ان کا تسلط خود بخود ختم ہوجائے گا، وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:-

"طالب علمی ہی کے زمانہ میں اسلامی جذبے کے ماتحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں
شریک ہوا، اور اپنے دوستوں تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے ساتھ
اس میدان میں اترا، اس وقت تمام اسلامی ممالک انگریزوں کے مظالم سے تباہ ہورہے
تھے، میرا عقیدہ تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے اسلامی ممالک ان کے مظالم
سے نجات نہیں پاسکتے، یہی اسلامی جذبہ طالب علمی کے زمانے میں چھایا رہا، جو خلافت کی مذہبی
تحریک کے زمانے میں انتہا کو پہونچ گیا جس سے مجھ کو ہر طرح کے مالی و جانی نقصانات
اٹھانے پڑے"

وہ انگریزوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دو انگریزوں کے
حوالے اپنی گفتگو میں برابر دیتے۔ دونوں کے نام مجھ کو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں، مگر
انھوں نے اُن کا ذکر اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعہ
کے لئے لکھا تھا جو ان کے نام سے ہیں، ایک انگریز نے جو برسوں ہندوستان میں رہ چکا تھا، ان سے

۱۹۱۱ء میں کہا کہ آپ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑیں گے، تو ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس انگریز کی پیشین گوئی کا ذکر برابر کرتے، اور کہتے کہ سیلون، برما، پاکستان، اور اب بھوٹان بھی آخر واقعی علٰحدہ ہو کر رہے اپنے ایک دوسرے انگریز کی یہ بات بھی دہراتے کہ اس نے اُن سے کہا کہ ہم لوگ جب ہندوستان چھوڑیں گے تو سارے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر کٹ مریں گے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان پر ڈاکٹر صاحب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس انگریز کی انجام بینی کی داد دیتے۔

کیمبرج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈاکٹر صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے۔ جو آخر وقت تک استوار رہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے

"میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔ م۔ سین۔ گپتا، میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے، شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، میرے زمانہ میں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔"

انگلستان کے قیام ہی کے زمانے میں اُن کو ۱۹۰۹ء میں گاندھی جی سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ وہاں جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے تھے، اُن کی ملاقات کچھ ایسی نیک اور مبارک ثابت ہوئی کہ آئندہ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے، اس وقت پٹنہ میں سر علی امام کا طوطی بولتا تھا،

ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز بیرسٹروں میں تھا وہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سیاسی خیالات میں قوم پرورانہ رجحانات رکھتے تھے، ان ہی کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ ہی میں بیرسٹری شروع کی، اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے، مگر ہندوستان کی آزادی کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہوئی تھی، وہ جلتی رہی، اسی لئے سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے، اس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق بھی جو بعد میں اپنی داڑھی اور مذہب کی وجہ سے مولانا مظہر الحق کہلانے لگے تھے، ہندوستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے، اُن کی نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اٹھی، اور اپنی صاحبزادی سے اُن کی شادی ۱۹۱۵ء میں کر دی، مسٹر مظہر الحق کانگریس کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں بھی ڈاکٹر صاحب کی وطنیت کی کیمیا کو ضرور آنچ ملی۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا کانگریس کے ممبر بنے، اور اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک مخلص کھدر پوش کانگریسی رہے،

اُن کو شعر و شاعری، اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رہا، مگر ان پر سیاست کچھ ایسی حاوی رہی کہ وہ ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے، تو ان میں بھی اپنے ملی اور وطنی جذبات کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتے، مثلاً اُن کو غالب کے کلام سے بڑی دلچسپی رہی، انھوں نے غالب پر ایک مقالہ ۱۹۱۹ء میں لکھا، اس میں انھوں نے غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعت نظر، عالمگیر ہمدردی، غم خواری، انسان اور اس کے فضائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی طرفگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے، اور اُن کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تغیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا، ان کا کلام شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے

کی عمیق النظری شبلی کی بلند خیالی ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے، یہ تعریف غالب اپنے کانوں سے سنتے تو اپنی نا قدری کی شکایت نہ کرتے، مگر اسی کے ساتھ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھ گئے کہ غالبؔ کی غزلوں کے اشعار میں اُن کے زمانہ کے خونچکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاستدانوں کی طرح غالبؔ نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں :-

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دہلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفاء کے مکان ویران اور برباد کر دیئے گئے، پورا شہر صحرا ہو گیا تو غالبؔ اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں :-

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، اُن کو دیکھ کر غالبؔ نے کہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب کو جس طرح مٹایا اس کا اثر غالبؔ کے دل پر بھی ہوا، انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، جو حقیقتہً دل کو ہلا دینے

والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلوا تا ہے، اس کی مثال اس قطعہ کے اشعار میں پیش کی جو حسب ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اس لئے فرماتے ہیں -

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق — میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اسی قسم کے اور بہت سے خیالات کا اظہار کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں :-

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالبؔ کے پانچویں اڈیشن میں بھی شامل ہے۔ اس پر آسی مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف، شیخ اکرام وغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں، اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ مگر وہ غالبؔ کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی زیرِ تالیف کتاب "غالبؔ مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالبؔ کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کئے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے، لیکن اُن کے

مجموعۂ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے، یا اُن کے خطوط میں دہلی سے جو محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے، یا اُن کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں، یا پھر اُن کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی، اور موقع بموقع اپنی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق اُن کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کرکے مجھ سے سُنا اور سُن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی، تم نے منتقل کرا دی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں، لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا، وہ صحیح تھا، خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں،

ان کا ادبی اور علمی ذوق اُن کے سیاسی ذوق کی وجہ سے دبتا چلا گیا، ۱۹۲۰-۲۱ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں دونوں ساتھ چل نکلیں تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پریکٹس چھوڑ دی، اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر پُراثر مضمون لکھا ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بڑے جوش و خدمت اخلاص و کمال دیانت کے ساتھ کیا، جب ۱۹۲۱ء میں علی برادران قید ہو گئے تو اُن کی والدہ بی اماں مرحومہ کے دوروں کا انتظام کرایا، ان ہی دنوں انھوں نے ایک انگریزی کتاب "خلافت اینڈ انگلینڈ" لکھی، اور بھی بہت کچھ لکھا لکھایا، اسٹیٹسمین، اس وقت کا طاقتور اخبار تھا، وہ خلافت والوں

کی دیانت و امانت پر زور و شور سے حملہ آور ہوا، دفاع میں سید محمود بھی میدان میں اُترے اور دلائل و اعداد کی توپوں سے اس مورچہ کو سر کر لیا،"

خلافت کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل خط سے بھی ہوگا،

"۴۶ - رپن لین کلکتہ

جبی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ تار اور پھر خط پہنچا، آپ کا خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا، منتظر تھا کہ اس کا جواب آپ کی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں، بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کر رہا ہوں، بہار کیلئے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی، بشرطیکہ کم سے کم آپ پوری طرح مستعد ہیں، گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں، اس لئے غالباً میں عید کی شام ہی کو بمبئی کے لئے روانہ ہو جاؤں اور پھر واپسی میں بانکی پور ٹھہروں، آپ بہار کے لئے ایک منظم اور طے شدہ پروگرام طیار کر رکھیں، اور میرے لئے ایک ایک دن صرف ان جگہوں میں ٹھہرائیں، جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بمبئی اور مرکزی خلافت کی ضروریات اور باہر کے عاجز کن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام ویسا ہی دھرا ہے، اور شوال میں اس کیلئے کافی وقت نکالنا نہایت ضروری ہے، ۱۴؍ جون سے ۲۵ تک بنگال کے لئے قرار دے چکا تھا، اور بعض مقامات کو مطلع بھی کر چکا تھا، لیکن آپ کے خط کی وجہ سے بہار کو ترجیح دی، اور بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈال دیں، بس اس کا لحاظ رہے کہ کم سے کم وقت وہاں صرف ہو، اور صرف ناگزیر اور واقعی ضروری مقامات سردست منتخب کرلئے جائیں، پھر جولائی میں انشاء اللہ بقیہ مقامات کا بھی دورہ ہو رہے گا،

امید ہے کہ آپ کی آمادگیاں جس کا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا، قائم ہوں گی بلکہ مزید محکم و استوار۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کچھ دنوں معیت رہے، اور آپ کی خواہش کے مطابق سفر و حضر میں یکجائی ہو، علی الخصوص سفر میں، خدا نے چاہا تو موجب نتائج و ثمرات ہوگا،

امید ہے کہ مسٹر مظہر الحق (جن کو اب بقاعدۂ عام مولانا مظہر الحق کہنا چاہئے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہوں گے) بدستور مشغول و منہمک ہوں گے، اب ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے ایثار و اخلاص کو مزید قبولیت و ثمرات عطا فرمائے،

(فقیر ابوالکلام احمد کان اللہ لہ)

۱۹۲۲ء میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بڑے شد و مد کے ساتھ بڑھیں تو ہزاروں محبان وطن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بکسر شاہ آباد (بہار) کے برطانوی جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہونا پڑا، اس وقت ہندو مسلمان کے اتحاد کا بڑا ہی شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا، گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان وغیرہ شمع اتحاد کے پروانے بنے ہوئے تھے، ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ جذبہ اپنی انتہا تک پہونچ گیا تھا، بکسر جیل ہی میں انھوں نے ایک تحریر لکھنی شروع کی، جو پہلے تو روزنامہ خلافت بمبئی میں کئی مہینوں تک باقاعدہ شائع ہوتی رہی۔ پھر نظامی بک ایجنسی بدایوں سے ۱۹۵۵ء میں کتابی شکل میں "آج سے قبل کا ہندوستان" کے نام سے شائع ہوئی،

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے علی گڈھ کے ہندو مسلمان طلبہ کی مجلسی گفتگو کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ذہنی موانست اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کی خاطر ان

کی گزشتہ تاریخ کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بظاہر کوئی تحقیقی کتاب نہیں لیکن اس میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ تاریخ ہند کے محققوں کیلئے سبق آموز اور مشعل راہ بھی ہیں۔ سارے تاریخی واقعات عبدالرحمٰن (بجنوری) کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ عبدالرحمٰن دراصل خود ڈاکٹر صاحب ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن کی زبانی کہہ گئے ہیں، اپنا نام کہیں آنے نہیں دیا ہے۔ جو اُن کی کسر نفسی کی دلیل ہے۔ اُن کا آخر وقت تک خیال رہا کہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف، پھوٹ، اور کدورت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندوستان کی تاریخ کیا پڑھتے ہیں، بلکہ اسی کے ذریعہ بس ملے دودھ پیتے رہتے ہیں، ان ہی کو پی کر جوان ہوتے ہیں، اپنی اس کتاب میں اسی بس کو دور کرنے کی کوشش کی،

انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اگر وہ ہندوؤں کے مذہب ان کے مقدس رشیوں اور بزرگوں کے طریق علم و عمل کا مطالعہ کریں، تو اُن کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے یہاں بھی خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی، ہندو بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اس کی ابتدا اور انتہا نہیں، ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، قادر مطلق ہے، دانائے کل ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، سب کی حفاظت کرتا ہے، اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ اس کے ضرور قائل ہیں، کہ خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے، اسی کو اوتار کہتے ہیں، مگر وہ اوتار کو خدا نہیں تسلیم کرتے، وہ بت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں، لیکن وہ دراصل اس کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو اپنی دلجمعی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، تاکہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو) وہ اپنی مدد خدا ہی سے ڈھونڈتے ہیں، اور اسی کی پاکی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، اُن کی

مقدس کتاب رگ وید کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے، اُن کی اور مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کرنے کا ذوق رہا، ان میں بھی سخاوت، مروّت، شجاعت اور شرافت، نیکی، نیک خیالی، ہمدردی، رواداری، سیر چشمی، وضعداری، اور سعادت مندی کی تعلیمات ہیں، اُن کی تہذیب، تمدن، علم، شاعری، فلسفہ، اخلاقیات، ریاضیات، نجوم، منطق، موسیقی، فنِ تعمیرات، زراعت، پارچہ بافی، رنگ سازی وغیرہ کی بھی ترقی ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان ساری باتوں کے روادارانہ طور پر مطالعہ کرنے کی تلقین کی،

پھر انھوں نے ہندؤں کو یہ سمجھایا کہ وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو اتنا برا نہ تصور کریں جیسا کہ وہ کرتے ہیں، پھر ہر مسلمان حکمراں کی کچھ نہ کچھ خوبیاں بتائیں، مثلاً انھوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم اتنا روادار تھا کہ جب وہ سوا تین برس حکومت کر کے خلیفہ کے حکم سے واپس بلایا گیا تو تمام ہندو اس کے لئے زار زار روتے تھے کیمبرج میں اس کا بت بنا کر ایک عرصہ تک پوجتے رہے، محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کسی ایک ہندو کو بھی بزور مسلمان نہیں بنایا، راجہ تلک اس کا میر منشی اور پھر سپہ سالار مقرر ہوا، اس کو دربار کے تمام امراء پر فوقیت حاصل تھی، ایک دوسرا ہندو شیوندرائے نامی بھی اس کی فوج کا سپہ سالار تھا، ناتھو نامی ایک اور ہندو محمود کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھا، ایک اور فوجی کمانڈر بیجے رائے نامی تو محمود کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا، اس کا دربار شاہی میں بڑا رتبہ تھا، محمود گجرات، پنجاب، قنوج میں پھرتا رہا لیکن وہاں کے مندر نہیں ڈھائے، عربوں کے زمانہ میں ملتان کے ایک مندر کو گرا کر اس جگہ مسجد بنائی گئی تھی، اُس نے ملتان فتح کیا تو اس مسجد کو نماز کے لئے بند کردی کہ وہ غصب سے حاصل ہوئی تھی، اس نے سومنات کا مندر ضرور گرایا، لیکن

اس نے متھرا کے مندروں کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے، شہاب الدین غوری بڑا خدا ترس حکمران تھا، اس کو اپنی رعایا کی بہبودی کا بہت خیال رہا، التمش کی عدل پروری کی شہرت دور دور تک تھی، رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی اچھے سے اچھے حکمراں میں ہو سکتی ہیں، نصیر الدین محمود دنیا کی تاریخ میں بڑا عادل، نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ سمجھے جانے کا مستحق ہے، بلبن کی حکومت انصاف و عدل کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں یاد کی جائے گی، جلال الدین خلجی کی نیک چلنی، رحم دلی، اور دشمنوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے سب ہی مداح تھے، علاء الدین خلجی کے زمانے میں غلے کی ایسی ارزانی تھی کہ پھر کبھی ہندوستان کو ایسی نصیب نہ ہوئی، اس کے عہد میں ایک شخص بنگالہ سے کابل اور مالابار سے کشمیر تک بلا خوف و خطر قیمتی سامان کے ساتھ سفر کرتا تھا، اُس نے ملک کے دفاع کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ مغل برابر پسپا ہو کر واپس جاتے رہے، محمد تغلق نے تمام ملک میں شفاخانے بنوائے، صرف دہلی میں ستر شفاخانے تھے، بارہ سو اطبا ملازم تھے، غرباء و مساکین کے لئے خیرات خانے تھے، جن میں غریب ہندو مسلمان کو خیرات بٹتی تھی، ملک میں تعلیم کا خاص انتظام تھا، صرف صوبہ دہلی میں ایک ہزار کالج تھے، فیروز شاہ تغلق نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، نہریں جاری کیں، بے شمار میووں کے باغات لگائے گئے، صرف شہر دہلی میں بارہ سو باغات تھے، رعایا خوشحال رہی، اُن کے پاس دولت، مال، زیور، سونا اور چاندی کی کثرت رہی، خضر خاں اپنے امراء اور رعایا میں ہر دلعزیز رہا، سیدوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں بڑا دخل تھا، سدانند اور سدا پال دربار کے بڑے معزز امراء تھے، وہ امروہہ، بیانہ، جونول اور گہرام کے گورنر مقرر ہوئے، سکندر لودی جفاکش، رحم دل، منکسر، نیک طینت، اور

نیک طبع بادشاہ تھا، مغلوں کی حکومت کی تعریف تو غیر بھی کرتے ہیں، ان کے دورِ حکومت میں ہندوستان عروس البلاد بن گیا تھا، اس دور میں شیر شاہ کے ساتھ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اورنگ زیب ہندوؤں میں ضرور بدنام ہے لیکن اگر وہ چند الزامات سے اپنے کو بری رکھتا، اور اس کی طبیعت دو ایک برائیوں سے صاف ہوتی، تو شاید وہ دنیا کے چند مشہور بادشاہوں کے ساتھ شمار کیا جاتا، شجاعت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال، محنت، تہذیب، علم، بردباری عقل و فراست میں اورنگزیب اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اس پر مندروں کے منہدم کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے، مگر اورنگزیب ایک موقع پر بنارس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ بنارس کے برہمنوں اور ہندوؤں کو ان زمینوں پر جو ہندوؤں کی ہیں، اور قدیم زمانے سے انہی کے قبضہ میں ہیں، بت خانے بنانے سے روکتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کے ہندو پریشان اور متردد ہیں، تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو بت خانہ اپنی زمین پر بنانے سے کوئی شخص نہ روکنے پائے، اور نہ ان کی عبادت میں کوئی مزاحم ہو، تاکید جانو"

پھر اسی اورنگ زیب نے ہندو مندروں کے لئے جاگیریں دیں، پجاریوں کے لئے وظیفے مقرر کئے، بہت سے مندروں کے پجاریوں کے پاس امداد کے سلسلہ میں اس کے شاہی فرامین موجود ہیں، مغلوں کے آخر زمانے میں ہندو امراء دربار پر چھائے رہے، رتن چند اور راجہ اجیت سنگھ تو سید عبد اللہ اور سید حسین کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں برابر کے شریک دار تھے۔ رتن چند کے اختیارات تو اتنے وسیع تھے کہ ساری سلطنت میں قاضیوں کی موقوفی اور بحالی اسی کے ہاتھ میں تھی، محمد شاہ کے عہد میں چھبیلا رام احمد آباد

کا گورنر اور راجہ خوشحال رائے اس کا سکریٹری تھا، اودھ
کا گورنر راجے بسنت رام آگرہ
میں نواب شجاع الدولہ کی سلطنت کا دراصل مالک راجہ بینی بہادر تھا، نواب صفدر جنگ کے وقت میں فوج کا کمانڈر انچیف مہاراجہ نول رائے تھا، آصف الدولہ کے زمانہ میں راجہ سورت سنگھ بریلی کا گورنر تھا، اور خوشحال رائے بخشی الممالک، پھر بعد میں وہ الہ آباد کا گورنر ہوا، بنگال میں راجہ موہن لال سراج الدولہ کا دیوان اور اس کی سلطنت کا مختار کل تھا، اسی کے زمانہ میں راجہ رام نرائن بہار کا گورنر رہا، الخ الخ"

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مثالیں گو بہت زیادہ پیش کر دی گئی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وطنی جذبے کی بنا پر اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کو برا کہنے کے روادار نہ تھے، تو پھر اپنے ملی جذبات کی بنا پر نہ صرف اسلام، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے بارہ میں بھی اُن کی برائیاں سننا پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کو اچھا سمجھنے کی تلقین کرتے۔ ان ہی وطنی اور ملی جذبات کی ملی جلی شکل کا نام ڈاکٹر سید محمود تھا، اگر ان پر کبھی ضرورت سے زیادہ وطنی جذبہ غالب ہو جاتا، تو کبھی ملی جذبات سے بھی وہ مغلوب ہو جاتے، ان کے ان دونوں مشترک جذبات کی قدر کرنے والے زیادہ نہ تھے، مگر جنھوں نے قدر کی، اُن کی نظروں میں وہ باوقار رہے،

وہ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اسی کے بعد وہ نہرو خاندان سے ایسے وابستہ ہوتے گئے، کہ وہ اس خاندان کے رکن معلوم ہونے لگے، کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں اُن کا برابر کا حصہ رہا، مگر ۱۹۲۳ء کے بعد ملک میں ہندو مسلم یکجہتی کا وہ خوشگوار منظر دیکھنے میں نہیں آیا، جو ۲۱-۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے زمانہ میں آیا تھا، دو تین سال کے اند

ہی ہندو مسلمان کے تعلقات بگڑنے لگے، کشیدگی بڑھی، فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے، عدم تعاون اور خلافت دونوں کی تحریکیں بے جان سی ہوتی چلی گئیں، ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پھر اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنی چاہی، مگر اُن پر گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور جواہر لال نہرو کا ایسا دباؤ پڑا کہ سیاسی کاموں سے الگ نہ رہ سکے، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ ان کو دیا گیا لیکن انھوں نے انکار کیا،

میں نے ان کو پہلی دفعہ مظفر پور (صوبہ بہار) میں ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، وہاں مولانا شوکت علی تشریف لانے والے تھے، ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مسلمان اُن کے استقبال کے لئے پہونچے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، جاڑے کا موسم تھا، گاڑی صبح کے وقت پہونچی تھی، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولا گیا، مولانا شوکت علی ڈبے کے پھاٹک پر نمودار ہوئے، تھوڑی دیر میں ڈاکٹر سید محمود بھی دکھائی دیئے، اس زمانہ میں کانگریس سے مسلمانوں کی بدگمانی شروع ہو گئی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے مسلمانوں نے کوئی خاص گرمجوشی نہیں دکھائی، ایک صاحب میری بغل میں کھڑے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کے خاص آدمی ہو گئے ہیں" میں خاموش رہا، ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہنے کے بعد یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے، وہ اپنے وطنی جذبے میں جو کچھ کرتے رہے، اس میں ان کا صرف اخلاص تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے مخلصانہ جذبات کو مسلمان مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے، دیکھے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے وطنی جذبات کو تو ہندو پریس میں خوب اچھالا جاتا لیکن وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں جو کچھ کہتے یا کرتے، وہ پریس میں بلیک آوٹ ہو جاتا تھا، ڈاکٹر صاحب کی طرح دوسرے کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا بھی

یہی المیہ رہا، اُن کی زندگی کا ایک ہی رُخ پریس میں آیا، دوسرے رُخ پر پردہ پڑا رہا، اس سے ملک کو بھی نقصان پہونچا، مسلمان کانگریسی رہنما مسلمانوں کے لئے جو ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، وہ بھی پریس میں آتے رہتے، تو اُن کی قیادت بھی ضرور موثر اور مفید ہوتی رہتی، ڈاکٹر صاحب ہی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں بہت کچھ کیا،

مثلاً ملا بار میں موپلاؤں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، اُن کو ٹرین کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر جلا وطن کیا گیا، ان کے گھر برباد کر دیئے گئے، اُن کو اپنی املاک سے محروم کر دیا گیا، ان مظالم کی تحقیقات کے لئے پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی، پھر سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ بھی جو مظالم ہوئے اُن کی تحقیقات کی تحریک بھی ان ہی کی کوشش سے ہوئی، لیکن یہ سب کچھ پریس میں نہیں آیا، اور عام مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب وہی سب کچھ کرتے ہیں جو کانگریس کرنے کو کہتی ہے؛

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اس فرض کو وہ ۱۹۳۰ء تک انجام دیتے رہے، اس دور کی کانگریس کی تاریخ میں اُن کا نام بھی نمایاں طور پر لکھے جانے کا مستحق ہے، اُن کی اس زمانہ کی پوری سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس مقالہ کا مقصد نہیں،

۱۹۳۰ء میں وہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پھر جیل گئے، اُن کے جیل جانے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ تو انھوں نے خفیہ سنجر سسٹم کا طریقہ اختیار کیا، جس سے کانگریس کو اس کے کاموں میں بڑی مدد

ملی، پھر انہی کی مساعیِ جمیلہ سے ہندوستان کی کپڑوں کے ملوں پر کانگریس کا اقتدار حاصل ہوا، کانگریس میں مسلمانوں کی آواز کو موثر بنانے کے لئے ۱۹۳۰ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کو عمل میں لائے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کے لئے ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز پیش کی، جو الہ آباد میں بلائی، اس میں ہندوؤں کے تمام سربرآوردہ رہنما شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے نتیجے سے خوش تھے، کہ اس میں مسلمانوں کے تحفظات اور مطالبات کے تمام بنیادی اصول مان لئے گئے تھے، جو بعد میں برطانوی حکومت کے ۱۹۳۵ء کے کیمونل اوارڈ کی شکل میں نمودار ہوئے،

ان کی سیاسی سلامت روی اور دیانت داری کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی کبھی اُن سے بدظن نہیں ہوئے، مولانا محمد علی کو کانگریس سے اختلاف ہوا تو وہ اس سے دور ہوتے چلے گئے: ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس سے وابستہ رہے، اس کے باوجود مولانا محمد علی کو ان کی ذات پر پورا اعتماد رہا، ان کو آخر وقت تک عزیز رکھا، اُن کو خط لکھتے تو "پیارے محمود" سے مخاطب کرتے، اور کھل کر اپنے دل کی باتیں لکھتے، ۴ر مئی ۱۹۲۹ء یعنی اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ڈاکٹر صاحب کو ایک مکتوب لکھا اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:۔

"پیارے بھائی، بظاہر یہ دو سال ہمارے Character کے امتحان کا زمانہ ہے، سب کا پرکھا ہو رہا ہے، ہم لوگ دشمنانِ ملک اور رہزنانِ ملت ہیں، آج ..... زرطلب ملک پرور ملت دوست ہے،..... جن کو ساری عمر ہم نے گالیاں دیں اور کوسا، یہ ہم کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں، سو جس طرح ہم مالوی اور منجے کے یا نہرو اور چنتامنی کے آلۂ کار نہیں بن سکتے، اسی طرح شفیع اور عبدالرحیم کے بھی آلۂ کار نہیں بن سکتے،

اس وقت سوائے اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے، کہ دوا سے تھک کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں، اور مسلمانوں اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کر دیں، اور اُس وقت کا انتظار کریں جب کہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزا چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے اور التجا کریں گے، چلو بھی انگریزوں اور اُن کے ہندو اور مسلمان غلاموں سے نجات دلا دو، خدا وہ وقت جلد لائے، یا ہم کو جلد اس دنیا سے اٹھالے، آمین، بہن اور بچیوں کو پیار،

"تمہارا بھائی محمد علی"

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کے بڑے پرستاروں میں ہیں، اُن سے گہرے ذاتی تعلقات بھی رہے، ڈاکٹر صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے، اُن کے اور علی برادران کے تعلقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے،:۔

"سید محمود بڑی خوبیوں کے مالک تھے خصوصاً مشرقی قسم کی اخلاقی خوبیوں کے دردمندی، انکساری، مہمان نوازی، اور سب سے بڑھ کر مروت کے، شروع میں علی برادران سے خوب نبھ گئی، لیکن آگے چل کر کہنا چاہئے، ۲۹-۱۹۲۸ء میں جب گاندھی جی اور علی برادران میں اختلاف ہوا، تو بے چارے کی پوزیشن عجب نازک سی ہو گئی، ادھر گاندھی جی کا اعتماد انھیں پورا حاصل تھا، اُدھر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بات علی برادران کی ضائع ہو، چھوٹی کمیٹیوں میں ووٹ دیتے وقت عجب کشمکش میں پڑ جاتے۔ اور کوشش اپنی والی یہی کرتے کہ مروت کی عدالت سے ڈگری کسی کے خلاف بھی نہ صادر ہونے پائے، بے تکلف دوستوں پر یہ راز کھل گیا تھا، وہ شرافت کے اس منظر سے لطف لیتے؛"

ڈاکٹر صاحب کے سامنے مولانا محمد علی صاحب کا تذکرہ آجاتا تو وہ بھی اُن کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کرتے۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو مرثیہ مولانا محمد علی پر ہے

اس کا یہ مصرع پڑھ کر اُن کو یاد کرتے،

ع عجب مستے عجب دیوانہ بودے

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد جب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب بھی ترہت (صوبہ بہار) کے دو حلقوں سے کھڑے ہوئے، اور کامیاب رہے، ان کو اپنے انتخابی حلقہ میں ایسی مقبولیت رہی کہ مسلم لیگ بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں ان کو شکست نہ دے سکی، جداگانہ اور مخلوط انتخاب دونوں میں وہ ۱۹۶۵ء تک وہاں سے برابر منتخب ہوتے رہے؛

۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب بہار میں وزارت بنی تو وہ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ اُن کے عقیدت مندوں کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات اور آل انڈیا حیثیت کی بنا پر بہار کے وزیر اعلیٰ بنائے جائیں گے، لیکن ان کی جگہ پر سری کرشن سنہا اس عہدۂ جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس ناانصافی پر ڈاکٹر صاحب کو اندرونی شکایت تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی، لیکن ان کی طبیعت میں جارحیت، جھگڑا، فساد، بالکل نہیں تھا وہ مکدر ضرور ہوتے۔ لیکن اپنے تکدر کا بوجھ خود برداشت کرلیتے، انھوں نے اپنی خانگی زندگی میں بھی غصے اور اشتعال کا اظہار شاید ہی کیا ہو، گھر میں کسی سے اُن کو رنج پہونچتا، تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر خوش ہوجاتے، انھوں نے سری کرشن سنہا کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور ان کو اپنا بھائی ہی سمجھتے رہے، اور جب اُن سے اس ناانصافی کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ خود اس عہدہ سے سری کرشن کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے، اس طرح نکتہ چینوں کا منھ بند کردیتے،

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

انقلاباتِ شب و روز کے حامل ہم ہیں
ہم ہیں اُن کی نگہ ناز کے قابل ہم ہیں

ذرہ ذرہ تری دنیا کا فسردہ ہوتا
باعثِ گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہم ہیں

سعیٔ پیہم پہ بھی جس کو نہ فرشتے سمجھے
روزِ اول ہی سے وہ عقدۂ مشکل ہم ہیں

جو حقیقت میں ہیں گردِ رہِ منزل اب تک
وہ سمجھتے ہیں چراغِ سرِ منزل ہم ہیں

وقت اپنا کے کبھی ہم سے کوئی کام تو لے
شورشِ سیل و سکوتِ لبِ ساحل ہم ہیں

ہاں حقیقت کی حقیقت سے خبردار ہیں ہم
کوئی حق ہیں ہو مگر عارفِ باطل ہم ہیں

ہمیں کونین نہیں، حاصلِ کونین ملے
جن کی ٹھوکر پہ ہیں کونین وہ سائل ہم ہیں

قوتِ سیلِ حوادث کا انھیں علم نہیں
جن کو یہ ناز ہے پرور دۂ ساحل ہم ہیں

شرط انصاف نہیں اوروں پہ تہمت رکھنا
اپنی تابندہ روایات کے قاتل ہم ہیں

چاہے ہر خواب رہے تشنۂ تعبیر عروج
جو کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں وہ سائل ہم ہیں

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

امانِ عشق آج بھی دستِ ہوس میں ہے
یہ طائر حسین ابھی تک قفس میں ہو

ہر چند ہوں فقیر ہما دسترس میں ہو
گو تشنہ لب ہوں آبِ بقا ہر نفس میں ہو

زد پر ہے آندھیوں کے ہر اک شمع انجمن
جو گل ہے نرغۂ ستم خار و خس میں ہو

صحرا نورد بادیۂ راز کے لیے
اک تازہ انکشاف صدائے جرس میں ہو

مدت سے ہو تلاش مگر کچھ پتہ نہیں
شاید ہما بھی آج کسی کے قفس میں ہو

نازک سی شے ہو دل اسے جو چاہو توڑ دے
ٹوٹے دلوں کو جوڑ سکے کس کے بس میں ہو؟

واماندگانِ راہِ غمِ زندگی سنو
اک مژدۂ سکون بھی شورِ جرس میں ہو

اے خوشنوا چلن ہو زمانے کا اب یہی
تیری جگہ چمن میں نہیں ہو قفس میں ہو

دل کو ولی کے لذتِ دنیا کی ہو تلاش
یہ شاہبازِ فکر شکارِ مگس میں ہو

غزل

از جناب اسلم صاحب سندیلوی

لب ہیں مجبورِ تبسم اشک افشانی کے ساتھ
مجھکو جینا ہے بہر صورت گرانجانی کے ساتھ

طنز تھا یہ بھی خرد کی کوشش ناکام پر
قہقہہ دیوانگی کا چاک دامانی کے ساتھ

گلستاں میں بارشِ شبنم، گلوں کا ابتسام
یہم پاشی کے مناظر ہیں زر افشانی کے ساتھ

زیست کی دشواریوں کا بس یہی انعام ہو
منزلِ آخر جو طے ہو جائے آسانی کے ساتھ

آج پھوٹا ہے میرے دل کا ٹپکتا آبلہ
اشک میں کچھ خون کی سرخی بھی ہو پانی کے ساتھ

دستِ گلچیں سے مگر اس کو اماں ممکن نہیں
پھول گو رہتا ہے کانٹوں کی نگہبانی کے ساتھ

کہہ رہی ہو، مٹ نہیں سکتا مقدر کا لکھا
اشکِ شبنم پر ہنسی گل کی پشیمانی کے ساتھ

یوسفستانِ محبت سے یہ آتی ہے صدا
چاک دامانی ہے لیکن پاک دامانی کے ساتھ

اس جہاں میں کون ہو اسلم کسی کا غمگسار
اب بھی آتی ہیں بہاریں جلوہ سامانی کے ساتھ

مطبوعاتِ جدیدہ

علی گڈھ ماضی و حال ۔ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی تقطیع بڑی صفحات ۴۸ کاغذ نفیس، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملیگی۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی ادارہ نہیں، بلکہ ان کی تہذیب ثقافت کی تربیت گاہ اور ان کی ملی حیات کا سرچشمہ بھی ہے، مسلمانوں کی فلاح و ترقی میں اس کا بڑا حصہ رہا ہے، ان کی بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں، جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی قابلیت کا ثبوت دیا اور ملک و ملت دونوں کی خدمت اور رہنمائی کا فرض انجام دیا اور آیندہ بھی مسلمانوں کی بہت سی توقعات اسی سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ ہندوستان میں ان کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے، اور اس سے ان کو بڑا ذہنی لگاؤ ہے، پروفیسر رشید احمد صاحب کی پوری زندگی علی گڑھ میں گذری، وہ اس کی تاریخ اور روایات کے اس دور میں بہت بڑے امین ہیں اور اس سے ان کو ایسی والہانہ شیفتگی ہے کہ اسکی علامت بن گئے ہیں، اسلیے اسکی ترجمانی کا سب سے زیادہ حق انھی کو ہے، جس کو وہ برابر ادا کرتے رہتے ہیں اور علی گڑھ ان کا خاص موضوع بن گیا ہے، یونیورسٹی پر بہتوں نے لکھا ہے، لیکن جو خلوص و دلسوزی اور یونیورسٹی کی روایات کا جو جاندار اور شاندار مرقع ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے اس سے دوسرے مضامین خالی ہیں، گذشتہ سال انھوں نے "سرسید میموریل لکچرز" کے سلسلہ میں "علی گڑھ کے ماضی و حال" پر ایک خطبہ دیا تھا جس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں علی گڑھ کی تحریک، اس کی جامعیت اور سرسید کے کارناموں کی مختصر

سرگذشت اور مسلم یونیورسٹی کی روایات وخصوصیات کو اس خوبی و اختصار سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یونیورسٹی کے مستقبل کا ہو جس سے مسلمانوں میں بےچینی ہے، رشید صاحب ان حالات سے مایوس اور شکستہ دل نہیں بلکہ یہ مژدہ سنایا ہے

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　　کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

اور موجودہ حالات کا تجزیہ کرکے حکومت، یونیورسٹی اور مسلمانوں کو بڑے مفید مشورے دیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت اور سیکولرزم کے فروغ اور ملک کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ اور اس کی ناگزیر ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے نوجوانوں کو آزاد ہندوستان کی تعمیر میں پورا حصہ لینا ہے۔ ان کے بغیر اس کی تصویر میں رنگ نہیں بھر سکتا، اس سلسلہ میں مسلمانوں کے بعض دوسرے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، رشید صاحب ان لوگوں میں ہیں جو ماضی سے رشتہ منقطع کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ پرانی بنیادوں پر حال و مستقبل کی تعمیر چاہتے ہیں، اس رسالہ میں بھی یہ چیز نمایاں ہے، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد - تقطیع بڑی، ضخامت ۳۶ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، پتہ: دفتر رسالہ فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ملے گا۔

یہ رسالہ بھی رشید صاحب کے قلم سے ہے، انھوں نے رسالہ فکر و نظر میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پر ایک مضمون لکھا تھا جس کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے، اس میں مسلم یونیورسٹی سے متعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ

سرسید اور ان کے رفقاء کے بعد مسلم یونیورسٹی کی سب سے زیادہ خدمت ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے کی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی، اور بڑے نازک موقعوں پر اس کو سنبھالا اور مختلف حیثیتوں سے ترقی دی، انجینیرنگ کالج انہی کا کارنامہ، میڈیکل کالج کی بنیاد بھی انہی نے ڈالی تھی، ان میں مسلمانوں کی تعلیم کی اتنی لگن تھی کہ اس راہ میں کسی رکاوٹ کی پروا نہ کی۔ اس کے لیے بدنامی بھی مول لی غریب طلبہ کی تعلیم کے لیے انھوں نے جس قدر آسانیاں فراہم کیں اور جتنے نوجوانوں کو کام سے لگایا۔ اس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے، ان خوبیوں کے ساتھ ان میں بعض خامیاں بھی تھیں، اور ان سے کون انسان خالی ہے، لیکن ان کی بیشتر خامیاں بھی درحقیقت یونیورسٹی اور طلبہ کے فائدہ ہی کے لیے تھیں، حکومت پرستی سے کوئی دور بھی خالی نہیں رہا ہے، لیکن پرانے حکومت پرستوں نے اس سے اپنی قوم و ملت کو فائدہ پہنچایا، اور موجودہ دور کے حکومت پرستوں کا مقصد صرف ذاتی منفعت ہے، اور اس کے لیے ان کو ملت فروشی میں بھی باک نہیں ہوتا۔

"م"

لاہور کا جو ذکر کیا - از جناب گوپال متل صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۵ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۶، پتہ: مکتبہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶

یہ مشہور صحافی و ادیب جناب گوپال متل کی ۳۲ء تا ۱۹۴۷ء کی دلچسپ یادداشتوں کا مجموعہ ہے، ان کی ادبی زندگی کی بسم اللہ اردو صحافت سے ہوئی تھی، اور یہ زمانہ انھوں نے اس کے مرکز لاہور کے مختلف اخباروں اور رسالوں کے شعبۂ ادارت میں بسر کیا تھا،

اس لیے ان کے تعلقات اس دور کے اکثر اہلِ قلم صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں سے تھے، جن میں بعض ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی سرگذشت کے ضمن میں ان لوگوں کے واقعات بھی تحریر کیے ہیں، اس لیے یہ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہے اور اس میں اس زمانہ کے لاہور کی ادبی انجمنوں، اخباری سرگرمیوں اور مختلف سیاسی و نیم سیاسی سماجی، مذہبی اور علاقائی تحریکوں خصوصاً احرار، کانگریس اور مسلم لیگ کا اچھا خاصا ذکر ہے، لیگ اور کانگریس کی بعض معرکہ آرائیوں کی روداد بھی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اس عہد کے حالات کی تاریخ بھی ہے، اور اتنی دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا،

نیم باز - از جناب عنوان چشتی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ ۲۵، پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جناب افتخار الحسن عنوان چشتی لکچرار اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے، "نیم باز" ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے، جو غزلوں، نظموں رباعیوں اور قطعات پر مشتمل ہے، عنوان صاحب نے "اپنی شاعری کو اپنی زندگی، زمانے اور ماحول کی لطافتوں اور کثافتوں کا عکس بنایا ہے"، اس مجموعہ سے بڑی حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے

واقعات النبی - مرتبہ مولانا عبد الباطن صاحب جونپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۰، قیمت عہ، پتہ: کتب خانہ کرامتیہ، محلہ ملاٹولہ، جونپور

اس کتاب میں رسول اللہ صلعم کے معجزات، اوصاف و محامد، پاکیزہ سیرت اور ستودہ کردار سے متعلق تقریباً دو سو ۲۰۰ موثر و سبق آموز واقعات جمع کیے گئے ہیں، زبان عام فہم اور پیرایۂ بیان آسان ہے اس لیے ہر مسلمان کے لیے مفید و کارآمد ہے۔

"ض"